بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جشنِ آزادی پر ہدیۂ تبریک

جب حضور نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ عاشورہ (دسویں محرم) کا روزہ کس تقریب کی یاد میں رکھا جاتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس روز بنی اسرائیل نے فرعون کی محکومیت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے یہ دن ایسا ہے جس کی یاد قائم رکھنا ضروری ہے۔

جس مسلمان کا یہ عالم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے یومِ آزادی کی یاد کو قائم رکھنا بھی اپنے لئے فریضہ سمجھتا ہے، وہ خود اپنی آزادی کے دن کی یاد کو کس طرح بھلا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں، وہ دن جب وہ محکومیت کے عذاب سے نجات حاصل کریں، سب سے بڑے جشن و مسرت کا دن ہوتا ہے۔ ایسا جشن جس سے دلوں میں شگفتگی، روح میں بشاشت، نگاہوں میں تازگی اور ذہنوں میں جلا پیدا ہو جائے جس سے اس قوم کے افراد کے اندر شرفِ انسانیت کا احساس بیدار ہو جائے جس سے وہ یہ کہنے میں ہزار فخر محسوس کریں کہ ہم دنیا میں کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتے، ہماری تقدیریں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ہم اپنے شب و روز کے آپ مالک ہیں۔ ہم اپنے حال کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارتے ہیں، ہم اپنے مستقبل کے سانچے اپنے پیمانوں کے مطابق آپ ڈھالتے ہیں، ہم خوب و ناخوب کا فیصلہ اپنے اندازوں سے کرتے ہیں، ہم اشیائے کائنات کی اقدار اپنے معیاروں کے مطابق متعین کرتے ہیں۔ ہم اپنے فیصلوں میں کسی کے چین جبیں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ارادوں پر کسی کے اندازِ ابرو کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ ہم اپنی نیند سوتے ہیں اور اپنی نیند جاگتے ہیں۔

خوش بخت ہے وہ قوم جسے یہ کچھ کہنے کی سعادت نصیب ہو جائے اور خوشتر از ہزار عید ہے وہ دن جو اس کے لئے اس آزادی کا پیغام لے کر آئے۔

سرزمینِ پاکستان کے رہنے والوں کے لئے 14 اگست کا دن، اسی جشنِ آزادی کا دن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہمایوں بخت ساعتیں جو آج سے اٹھاون سال پہلے ان کے لئے پیامِ حریت لائیں اور مسعود و میمون ہے وہ ملت جو اس نوید حیات بخش و نشید نشاط آور کی مورد و مہبط بنی۔

ہم اس مسعود و مبارک ساعت کی یاد میں تمام باشندگانِ پاکستان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

(ادارہ طلوع اسلام)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

طلوع اسلام کا ذکر ہائی کورٹ میں

محترم جسٹس ایم۔آر۔کیانی، جج ہائی کورٹ مغربی پاکستان نے 19 ستمبر 1957ء کو مقدمہ۔ غلام بھیک بنام مسمات حسین بیگم۔ میں اپنے فیصلہ کے دوران میں تحریر فرمایا:۔

''اسلامی شریعت کے چار مسلمہ ماخذ ہیں۔قرآن، حدیث (جسے بعض کے نزدیک سنت بھی کہا جاتا ہے)، قیاس (یعنی نصوص سے استنباط مسائل) اور اجماع (یعنی کسی خاص مسئلہ میں ایک زمانے کے مجتہدین کا متفق ہو جانا)۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کے احکام کی تفسیر میرے پیش نظر نہیں۔ان احکام کو بالعموم غیر متبدل تسلیم کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض تفاصیل میں ان کی تعبیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اصل دشواری حدیث کے بارے میں پیش آتی ہے جو سنت یا عمل رسول اللہ (ﷺ) کا ریکارڈ ہے۔قطع نظر اس کے کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص معاملہ کے متعلق حدیث کے مستند یا غیر مستند ہونے کا سوال مختلف فیہ نہ ہو، بعض صورتوں میں خلفائے راشدین، بالخصوص حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے تسلیم شدہ طریقہ سے اختلاف کیا ہے۔اس قسم کی بہت سی مثالیں ادارۂ طلوع اسلام (کراچی) کی طرف سے شائع کردہ کتاب

اسلام میں قانون سازی کا اصول

میں دی ہوئی ہیں۔ یہ کتاب ایک اعلیٰ درجہ کی تالیف ہے جس سے میں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔میرا خیال ہے کہ مبنی برسنت شریعتِ اسلامی کی تعبیر کا صحیح طریق یہ ہوگا کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ جو جزئیات سنت کی رو سے متعین ہوئی ہیں، ان میں زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل ہوسکتا ہے۔ایسا کہنے میں میں اظہار رائے نہیں کر رہا بلکہ جو کچھ ہوتا رہا ہے اسے بیان کر رہا ہوں۔اس مقام پر مجھے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ سنت کو مبنی بر وحی قرار دینے کے حق میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ محکم بنیادوں پر استوار نہیں۔''

(P.L.D. 1957-LAHORE, 998)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

شخصیت پرستی

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کر دے' ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے' ان کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو اور اس طرح انسان' کہ جسے فطرت نے اسے آزاد پیدا کیا تھا' ساری دنیا کی غلامی سے نجات پا کر' صحیح معنوں میں آزادی حاصل کر لے۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل' اس زریں نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا:

قل انما انا بشر مثلکم یو حی الی انما الٰھکم الہ واحد فاستقیموا الیہ واستغفروہ۔ وویل للمشرکینo

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے تمہارا الٰہ ایک ہی ہے۔ پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو اور اس سے مغفرت مانگو اور مشرکین کے لئے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکر اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گزرتے وقت فرمایا۔ ''اللہ اکبر! یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں''۔ اس سے مراد محض سلطنت و حکومت کی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف اور ہر حقیقت عظمیٰ کی مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر محسوس۔ محسوسات کا خوگر انسان' کہ جس کے سجدہ ہائے جبینِ نیاز بسیط سے بسیط حقیقتِ مجردہ کو بھی لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے رقصاں و جنباں رہتے ہیں' اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہو سکا اور اس نے وہ تمام پردے ایک ایک کر کے پھر سے گرا لئے جو اسلام سے پیشتر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حائل تھے اور جنہیں نبی عربی ﷺ نے ایک ایک کر کے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح و بسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کر کے گنا دیا تھا جہاں سے یہ پردے قلب و دماغ اور سمع و بصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک قرآن حمید آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لا سکے کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آ سکے۔ لیکن جب قرآن مہجور ہو گیا' جب بنی اسرائیل کی طرح اس نورِ مبین کو پس پشت ڈال دیا گیا' تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اس کا دستور غیر متبدل ہے۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا o آیئے ان

مختلف پردوں اوران کے حسین وجمیل نقش ونگار کوایک نظر دیکھیں جو عقیدت وارادت کے رنگوں سے مزین اوراطاعت ومتابعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔ اس لئے کہ جب تک آپ ان نظر فریب پردوں کی اصلیت سے واقف نہ ہوجائیں گے اس حقیقت عظمیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے جوصدیوں سے ان کے اندر لپٹی ہوئی ہے اور بے نقاب ہوکر جنت نگاہ نہیں بن سکی۔

رسول پرستی!: خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر انسانوں میں سے کسی کوخدا کی جگہ دی جاسکتی ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہو سکتی ہے۔ امم سابقہ کی روش اس باب میں جو کچھ رہی ہے اس پر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرامؑ خدا بنائے گئے یا اس کے بیٹے قرار دیئے گئے۔ الوہیت و ابنیت کی مقدس چادر اُڑھا کر انہیں مافوق البشر منوایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی صورت کو دیکھئے۔ لفظاً' معناً' مجملاً' تفصیلاً اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اس میں موجود ہوگی۔ یعنی قرآن کریم میں جس درجہ خدا کی توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے اسی درجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے۔ انہیں بشر مثلکم کہا گیا۔ انہیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وجعلنٰھم ائمة یھدون بامرنا و اوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوٰة وایتاء الزکوة وکانوا لنا عٰبدین o(۲۱/۷۳)

اور ہم نے ان کو امام وپیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو نیکی کرنے' نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ سب ہماری عبودیت اختیار کئے ہوئے تھے۔

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فقال رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر (۲۸/۲۴)۔

اور موسیٰ نے کہا کہ پروردگار آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لئے بھیجیں میں اس کا محتاج ہوں۔

انہیں اپنی ذات تک کے لئے نفع ونقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا' مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کرلیا کرتا اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لئے نذیر وبشیر ہوں۔ (۱۸/۷)۔

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے و امرت ان اکون من المسلمین وان اتلو القران اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ ان اتبع الا ما یوحی الی ہرچند وہ اطاعت وانقیاد کے اس بلند مقام پر تھے کہ ان سے احکام الٰہیہ سے سرکشی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بایں ہمہ ان کی بشریت وعبودیت کو پختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لئے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک ومعصیت کریں تو ان پر بھی اسی طرح عذاب ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر۔ بلکہ ان پر عام لوگوں سے دگنا عذاب ہوگا۔

اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی

طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے' اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔(۷۴۔۷۵/۱۷)۔

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں۔لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دیئے جاتا کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہئے تھا۔وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔(۷/۱۵)۔

جواب ملتا ہے کہ

ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے (۲۰/۲۵)۔

اور پھر عام انسانوں کی طرح' اپنے وقت پر' مدت حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے:

وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افائن مت فهم الخالدون o

اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔پھر اگر تم وفات پا جاؤ گے تو کیا وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۱/۲۴)

البتہ ان کی بصیرت حقائق و معارف کے اس افق اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ان کے مزکی و مقدس نفوس کی بلندیاں کائنات کے اس معراج کمال پر ہوتی ہیں' جہاں عام انسانوں کا شہپر تخیل بھی جلتا ہے۔ان کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں' بایں ہمہ وہ ہوتے انسان ہی ہیں' بشریت کی حدود سے خارج نہیں ہوتے۔خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں' خود معبود نہیں ہوتے۔اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لئے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں' بلکہ اس لئے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی محکومیت سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

وما كان لبشر ان يؤتيه الله الكتاب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونوا عبادا لى من دون الله ولٰكن كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب و بما كنتم تدرسون o(۳/۷۸)۔

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ (وہ یہی کہے گا) کہ تم اللہ والے بن جاؤ اس کتاب (کی اتباع) کے ذریعے جسے تم (دوسروں کو) سکھاتے بھی ہو اور (خود) پڑھتے بھی ہو۔

حضورﷺ خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ دین اپنی مکمل شکل میں امت کے پاس آ گیا۔

لیکن ذرا غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا۔کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لئے حضورﷺ تشریف لائے تھے۔یہ ''احمد بے میم'' (احد) اور یہ عرب بلا عین'' (رب)' یہاں تک کہ

وہی جو مستوئ عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک

نہیں بلکہ خدا کے محتاج ہیں' انہیں تمام دنیا کے نفع ونقصان کا مالک و مختار قرار دے دینا' انہیں (معاذ اللہ) خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں۔ انسان سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھتا ہے۔ عوام کے جذباتِ عقیدت کو جوش میں لانے کے لئے فی الواقع یہ جواب مؤثر نظر آتا ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ امم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض وعناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلو محبت ہی تو تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض وعناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل مضحکہ انگیز نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا وہ شرک تھا' اور اگر وہی کچھ اسی جذبہ کے ماتحت مسلمان کریں۔ تو عین توحید؟ ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا فطرت کا مذاق اڑانا ہے۔ اس میں کسے کلام ہے کہ حضور ﷺ کی محبت ایک مسلمان کے لئے متاعِ حیات ہے' ایسی محبت جو ماں باپ' اولاد' اموال' بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو اتباعِ کامل ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتشِ عشق ہو اس کا ایک لمحہ سو سال کی ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ سرد نمازوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے' یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کھٹکا مٹ جائے اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے نچھاور ہو کر ٹھکانے لگے۔ اسے ابھی حشر' نشر' حساب کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں اور اس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ تلوار رگِ جاں سے پہلے چھوئی تھی' یا جان بابِ جنت سے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(اقبالؒ)

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظِ مدارج ومراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو پی کر بہک گیا وہ خمخانۂ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنت کی شراب میں سب کچھ ہے لیکن سُکر نہیں ہے؟ لہٰذا' خدا خدا ہے اور رسول رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا کہ اسلام لانے کے لئے جہاں خدا کے لئے لا الٰـــہ الا اللـہ کی شہادت کی ضرورت ہے وہاں محمد کے لئے عبدہ ورسولہٗ کی شہادت کی بھی اور یہی ایمان ومحبت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رخ کے لئے دورِ رسالتؐ اور صحابہ کبارؓ کا طرزِ عمل دیکھئے۔ حضور ﷺ کی عمر بھر یہی تعلیم وتلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں اور اپنے ماننے والوں کے قلب ودماغ پر خدا بن کر نہ چھا جائیں۔ اس کے لئے حضورؐ نے ان میں حریتِ فکر ونظر کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں مشاورت' صحابہؓ کا کئی ایک مواقع پر حضورؐ کی رائے سے اختلاف اور اختلاف کی کامل آزادی' حضورؐ کی رائے کے متعلق یہ تحقیق واستفسار کہ آپ نے وہ رائے یا حکم بہ منصبِ رسالت دیا ہے یا ذاتی حیثیت سے' یہ سب اس چیز کا آئینہ دار ہے کہ حضورؐ ایک عبد مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقل

انسانی نے صحیح نشو ونما پائی اور جس انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا کہ دنیا میں سر اُٹھا کر چلے۔ اسلام انسان کو یہی سربلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا اور یہی اس دینِ فطرت کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب یہ خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے اُبھرے تھے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثمی رددنه اسفل سافلین۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

پھر اسے بھی سوچئے کہ ''محبت رسول'' سے مفہوم کیا ہے؟ یہ مفہوم قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ خود موجود تھے تو بہ حیثیت مرکز ملت آپ کی اطاعت فرض اولیں تھی اور اطاعت ایسی کہ ایک مستبد اور جابر حاکم کے احکام کی اطاعت نہیں بلکہ دل کے جھکاؤ کی اطاعت۔ اس لئے کہ یہ اطاعت' حضورؐ کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ احکامِ خداوندی کی اطاعت تھی' جن پر آپ خود بھی عمل کرتے تھے اور اُمت سے بھی عمل کراتے تھے اور احکامِ خداوندی کی اطاعت' انسان کی اپنی ''فطرتِ صحیحہ'' کے تقاضوں کی تسکین ہے۔ لہٰذا اس میں جبر کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا۔ جس اطاعت میں دل کی خوشی شامل ہو' اس کو محبت کہتے ہیں۔ آج رسولؐ اللہ سے محبت کا مفہوم ہوگا قرآنی نظام کی اطاعت اور ایسی اطاعت جو بہ طیب خاطر کی جائے۔

یہ ہے محبت کا صحیح مفہوم۔ نہ یہ کہ حضورؐ کے سرو قامت اور گیسوئے خمدار کی تعریف و توصیف میں نعتیہ غزلیں گائی جائیں یا رسول کو اٹھا کر خود خدا کی مسند پر بٹھا دیا جائے۔ اول الذکر وہ ''شاعری'' ہے جس سے قرآن نے منع کیا ہے اور ثانی الذکر وہ شرک جس کا تصور بھی ایک توحید پرست نہیں کرسکتا!

☆☆☆

ائمہ پرستی: رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اُمم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتا دیا کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اتخذوا احبار هم و رهبانهم اربابا من دون الله (۹/۳۱)

ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی اپنے مذہبی علماء و پیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضورؐ! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتا دیں اور اسے حرام سمجھتے تھے جسے وہ حرام کہہ دیں؟ یہی ''اربابا من دون اللہ'' بنانا ہے۔ یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لئے ہے وہ ان لوگوں کو دے دیں۔ یہی اُن کی پرستش ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ:

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دے دی جائے اور

(۲) اُن کے ارشادات کو تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔

اُمم سابقہ نے یہ کچھ اس لئے کیا تھا کہ اُن کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ اُن کے مذہبی راہنما تھے اور لوگ رشد و ہدایت کے لئے اُن کے محتاج تھے۔ چاہئے یہ تھا کہ لوگ اُن کے فیصلوں کے لئے کتاب کی سند مانگتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ اُن کے اراکین مذہب نے کہہ دیا اسے فرمودۂ الٰہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام اُن کے فیصلوں کو اسی لئے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ اُن کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے' یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ لوگ خدا کے

فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور ان ہی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب اُن کا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور اُن کا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالا از تنقید قرار دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا:

قل ان الھدٰی ھدی اللہ (۳/۷۳)۔

ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔

لہٰذا قرآن ہی کی اتباع واجب ہوئی۔ پھر:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح، مفصل اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا کہ اس کے سمجھنے کے لئے ''برہمنوں'' کی کوئی خاص جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ ردوبدل ہو سکے نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر صراط مستقیم پر چلتے جائیں، خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں، کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی۔ لیکن غور سے دیکھئے کیا ہم واقعی اس روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجئے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصرف بیش ازیں نہیں جانتے کہ یہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں کہ لا یعلمون الکتاب الا امانی۔ وہ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھئے یہی کہیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے، فلاں علامہ کی یہ رائے ہے، نسفی میں ایسا لکھا ہے، شارح وقایہ کا یہ خیال ہے۔ غرضیکہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رہ جائے گی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذالک مبلغھم من العلم کہیں خدا کا نام نہیں، کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں۔ اور اعتراض کیجئے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمتہ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو ارباب من دون اللہ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا؟

معاملہ یوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا الگ الگ نہیں اس لئے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ دین کی سمجھ رکھنے والے حضرات جمع ہوئے اور وقت کی ضرورت کو سامنے رکھ کر قانون کے ضابطے مرتب کئے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کر کے عدالتوں میں بھجوا دیئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے ان ہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہو کر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ قانون مرتب کر سکے یا ان میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ بعینہٖ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکۂ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلّف اور اس میں کمی بیشی یا ردوبدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) نہ تو حضرات فقہا قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانہ کی

ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں۔

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دے دیں۔

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بناء پر دوسروں کو قوانین میں ردوبدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہو گیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اس سے جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود تبرکاً دنیا میں رہے تو رہے عملی حیثیت سے امت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اب اس کے پڑھنے سے ثواب تو ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب منتروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ جس سے جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ کا کام لیا جا سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لئے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

تدوین فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہونا ہی تھا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصرِ مشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی اسی تقلید کے بادل چھا گئے۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ دین سے قطع نظر دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھ دیا قول فیصل اور حرف آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے، آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا ہے، نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا ہے۔ آپ کے سر میں نہ دماغ اپنا ہو سکتا ہے نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ دیکھنے کے لئے آپ کی آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی لیکن امت مسلمہ کی سطحِ فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مُردے اکھڑ گئے!
یہ مری جبین نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجئے، کیا یہ سلف کی پرستش نہیں! یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں!! کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک آنے والے واقعات کا مبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور ان کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا، انہیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں!! اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانیین) بننے کے لئے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا (۳/۷۹) اس نے تو قرآن کریم نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمہ لے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے محتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کر لیں۔

الٓرٰ۔ کتاب احکمت اٰیٰته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر الا تعبدوا الا الله اننی لکم منه نذیر و بشیر (۱۱/۲-۱)۔

ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبدیت اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تمکو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لئے آیا ہوں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ (اس دین کی غرض کیا بتاتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے واسطہ سے دنیا تک پہنچا۔ سورۂ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب وحکمت ونبوت عطا فرمائی' ان کو دیگر اقوام عالم پر فضیلت عطا کی اور انہیں دین کی بینات دی گئیں۔ لیکن انہوں نے علم آجانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے باہمی اختلافات پیدا کر لئے۔ ان کے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھر سے دنیا کو مل جائے۔ اس کے لئے

ثم جعلنٰک علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذین لا یعلمون (۱۸/۴۵)۔

پھر ہم نے تمہیں (اے رسول) دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین شریعت کہاں ہے؟ اس کا جواب بھی وہیں ہے۔

هذا بصائر للناس وهدی و رحمة لقوم یوقنون o (۲۰/۴۵)۔

(یہ قرآن) ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لئے ہدایت ورحمت۔

قرآن ہر زمانہ کے انسانوں کے لئے بصائر ہے۔ اس میں بار بار غور وفکر' تدبر وتفحص کی تاکید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شر الدواب کہا گیا' کہیں کالانعام بتایا گیا۔ جہنم ان سے بھری گئی' ان کے قلوب پر مہریں' ان کی آنکھوں پر پردے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔ کہئے جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو اور جس کے لانے والے کا خود دعویٰ یہ ہو۔

ادعوا الی اللہ علی بصیرة انا ومن اتبعن۔

میری اور میرے متبعین کی دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت ہے۔

اس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے۔ جمود وتعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے۔ قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لیجانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم' اجتماعی حیثیت سے' قوموں میں وراثتاً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جو قوم علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دنیا میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لئے آئی تھی۔ دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت جس کے ہاتھ میں ایسی عظیم الشان قندیل دی گئی تھی کہ اس کی روشنی مشرق ومغرب کے امتیازات مٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی اب ہر جگنو کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔ یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لئے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس کو باپ دادا کے ورثہ سے ریاست مل جائے وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تقلید اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب) لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم

نے اپنے آباء کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان ہی کے نشانات کا اقتداء کرتے چلے جارہے ہیں۔(۴۳/۲۳)۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مکافات عمل کے دن کہ جب ''سمع وبصر وقلب'' ہر ایک سے الگ الگ باز پرس ہوگی' آپ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی' فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دیں گے کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا۔

جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائیں گے اور سب عذاب کا مشاہدہ کریں گے ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے۔(۲/۱۶۶)

اس وقت متبعین سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جوان کی پرستش شروع کردی۔

کیا تمہارے پاس پیغمبر مبینات لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے(۴۰/۵۰)۔

اور یہ بھی سمجھ رکھئے کہ مکافاتِ عمل کے ظہور نتائج کا دن صرف مرنے کے بعد ہی نہیں آئے گا۔ اس جہان سعی وعمل میں' زندہ قوموں کے لئے ہر سانس ظہور نتائج کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر قیامت نمودار ہورہی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ایک نیا حشر بپا ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے؟ مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے۔ غلطی کر سکتے تھے۔ لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کرسکتی۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے دین وہی ہے' اور بس۔ وذٰلک دین القیم۔

اسلاف پرستی کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے بزرگوں سے غلطی کا امکان نہیں تھا۔ لیکن آپ اس دلیل کو ذرا آگے بڑھائیے تو اسکی حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جائے گی۔ یعنی ہم اپنے آپ کو غلطیوں سے منزہ قرار نہیں دیتے۔ لیکن ہمارے بعد کے آنے والے ہمیں اپنا اسلاف سمجھیں گے اور اسلاف سمجھ کر یہ عقیدہ قائم کرلیں گے کہ ان اسلاف سے غلطی نہیں ہوسکتی تھی البتہ ہم غلطی کر سکتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا۔ یقین مانئے! ہمارے اسلاف بھی ہماری طرح یہی کہتے تھے کہ ہم منزہ عن الخطا نہیں ہیں۔ لیکن یہ بعد کے آنے والے تھے جنہوں نے انہیں منزہ عن الخطاء قرار دے کر ان کے ہر فیصلہ کو وحی آسمانی کی طرح تنقید کی حدود سے بالاتر قرار دے دیا۔ امام یوسفؒ کا قول ہے کہ ''کسی شخص کے لئے ہمارے کسی قول کی اتباع جائز نہیں تاوقتیکہ وہ ہمارے ماخذ کو نہ جان لے۔'' امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص ہم کو بلا حجت لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ لکڑی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈال دے۔'' امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ ''میں بھی انسان ہوں میری رائے صائب بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔'' امام احمدؒ کا قول ہے کہ ''انسان کی ناسمجھی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دے دے۔'' وقس علیٰ ذلک۔ یہ حضرات وہ ہیں جنہیں اجتہاد تامہ کا درجہ حاصل تھا۔ جب وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے انہیں ہر طرح کی خطاء' سہو اور غلطی سے معصوم سمجھ کر ان کے اقوال کو پیغام خداوندی قرار دے دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ''چاروں اماموں کے فیصلہ کے بعد ہمیں آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔'' امام شافعیؒ کی خود یہ کیفیت تھی کہ ایک

سال ایک فیصلہ دیتے تھے لیکن دوسرے سال مزید تفقہ و تدبر سے اسے منسوخ قرار دے دیتے تھے۔ لیکن ان کے بعد ان ہی ائمہ کی تقلید کرنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''انسانی آراء واقوال تو ایک طرف ہر وہ آیت جو ہمارے مسلک کے خلاف جائے یا ماؤل ہے یا منسوخ''، یعنی قرآن کریم کو بھی ان حضرات کے مسلک کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اگر کوئی آیت قرآنی ان کے مسلک کے خلاف جائے گی تو یا تو اس کی ایسی تاویل کر لی جائے گی کہ وہ اس مسلک کے مطابق اتر جائے اور اگر اس کی ایسی تاویل نہ ہو سکے تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اللہ اکبر! خدا کے احکام انسانی فیصلوں کی رو سے منسوخ قرار دیئے جائیں گے۔

پھر مسلمان صدیوں سے تخریب وتشیع، فرقہ بندی اور گروہ سازی کی جس مشرکانہ زندگی سے گزر رہا ہے (کہ قرآن کریم دین میں تفرقہ اندازی کو صریح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے) غور سے دیکھئے تو اس کی تہ میں بھی اسلاف پرستی ہی کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ ہونے کو فرعی معاملات میں اختلاف کہاں نہیں ہوتا۔ اور تو اور خود صحابہ کبارؓ میں بعض مسئلوں میں ذاتی طور پر اختلاف تھا۔ حضرات ائمہ کا یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردانِ رشید امام یوسفؒ وامام محمدؒ سینکڑوں مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف رکھتے تھے۔ بایں ہمہ ان ذاتی اختلافات کی بنا پر وہ حضرات کوئی نیا دین، کوئی جداگانہ فرقہ نہیں بنا لیتے تھے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے جب اسلاف پرستی شروع کی اور ایک مخصوص مسلک کے متبعین نے سمجھ لیا کہ ہمارے مسلک کے مؤسس منزہ عن الخطاء تھے تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑا کہ اس مسلک کے خلاف چلنے والے بدیہی طور پر غلطی پر ہیں۔ یہی کچھ مخالف مسلک والوں نے سمجھا۔ نتیجہ اس کا بغیاً بینہم (باہمی ضد اور ہٹ) کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور یہی ضد اور ہٹ ہے جسے قرآن کریم اختلاف آرائی اور تفرقہ انگیزی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اور اس کے بعد (کل حزب بما لدیہم فرحون کے مطابق) ہر شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ ''ناجی'' اور باقی سب جہنمی ہیں اور ہر شخص کی تمام جدوجہد اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ اپنے فرقہ کو برسرحق اور دوسروں کو باطل پرست ثابت کر دے۔ نہ اس میں تحقیق کا مادہ باقی رہتا ہے، نہ حقائق کو خالی الذہن ہو کر پرکھنے کی صلاحیت۔ وہ اپنے مسلک کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے پاس اپنے مسلک کی حقانیت کے محکم دلائل ہوتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اگر اپنے مسلک میں کسی غلطی کا امکان تسلیم کرے تو اس سے اسے اپنے اسلاف میں بھی غلطی کا امکان ماننا پڑے گا اور یہ وہ چیز ہے جسے تسلیم کرنے کے لئے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے اس کے ''دین'' کی فلک بوس عمارت زمین پر آ گرتی ہے۔

پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ اختلافات بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی باتوں میں کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ کونسا ایسا معاملہ ہے جس پر یوں آستینیں چڑھائی جائیں۔ لیکن ان حضرات کے سامنے چونکہ زندگی کا کوئی صحیح مقصد نہیں، دین کا کوئی واضح نصب العین نہیں اس لئے وہ اختلافات کی ان حدود بندیوں کی حفاظت ہی کو ذریعۂ نجات سمجھے ہوئے ہیں اور ان کا تحفظ ہی ان کے نزدیک عین جہاد ہے۔ ایک دفعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب کا نہایت پرشکوہ جلوس جا رہا ہے۔۔۔ ''غازی اعظم زندہ باد'' کے فلک شگاف نعروں سے فضا مرتعش ہو رہی ہے۔ مسرت کے شادمانے بج رہے ہیں۔ خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے

کسی مجلس مناظرہ میں امام ابوحنیفہؒ کی شان میں سوء ادبی کے کلمات کہے۔ اس پر مقلدین حضرات نے ان پر مقدمہ چلایا۔ مقدمہ نے طول کھینچا' سزا ہوئی لیکن اپیل میں بری ہو گئے اور اب فاتحانہ انداز سے مظفر و منصور خیر سے مراجعت فرمائے وطن ہو رہے ہیں۔ آپ ان روح فرسا مناظر کو دیکھ کر بے شک ہنس دیجئے۔ لیکن ان کی اہمیت ان حضرات سے پوچھئے۔ ان کے نزدیک تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ ہی یہی ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کہ اسلاف پرستی نے درحقیقت خدا پرستی کی جگہ لے رکھی ہے۔ جو کچھ خدا کے لئے ہونا چاہئے تھا وہ سب اسلاف کی عظمت و عقیدت کے لئے ہو رہا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی احکامات و مسائل درحقیقت ان قوانین کا نام نہیں جو اسلامی سلطنت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ سلطنت تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکی لیکن ان قوانین کی فرعی اختلافات کی جنگ برابر جاری ہے۔ ان حضرات کی عمر ان اختلافات سے متعلق بحث و جدل میں گزر جاتی ہے۔ لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ اس قوت کے پیدا کرنے کی بھی کوئی تجویز کی جائے جس کی بناء پر ان قوانین و احکام کو منوایا جائے گا۔ اور حق یہ ہے کہ جس قوم کے قوائے ذہنی و عملی پر اس درجہ تعطل و جمود چھا جائے وہ کش مکش حیات سے اسی طرح گریز کیا کرتی ہے اور یہ نفس انسانی کی شعبدہ کاریاں ہیں کہ وہ اس فرار کو بھی جہاد بنا کر دکھا دیتا ہے۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے' لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور مامور من اللہ مانتے ہیں اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اس قسم کے عقائد کو قرآن کریم کی رو سے نسل پرستی سمجھے اور اس مقصد عظیم کی نقیض جس کے لئے اسلام آیا تھا' وہ ان حضرات سے کسی کلمۂ مشترکہ پر افہام و تفہیم کی بات کیسے کرے؟ لہٰذا ان حضرات سے ہمارا تخاطب ہی لاحاصل ہے۔

☆☆☆

رواۃ پرستی: اسلام کا نصب العین تو یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرے۔ لیکن بعد میں مسلمانوں نے کس طرح اپنے اور اپنے خدا کے درمیان مختلف حاجب و دربان مقرر کر لئے اور دین کے راستے میں براہ راست خدا تک پہنچنے کے بجائے راستہ میں ''ارباب من دون اللہ'' کا دامن تھام کر بیٹھ گئے۔ اس سلسلہ کی پچھلی کڑی میں اس کو رانہ تقلید کا ذکر آیا تھا جو ائمہ پرستی کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس نمودار ہوا اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کی شکست و ریخت کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شاید ابھی مسلمانوں کے ابتلاء کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ

خواستم پیکاں برآرم۔ درجگر نشتر شکست!

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے لیکن خود ایک اور جھاڑی میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ ''جھاڑی'' عقیدت و ارادت کے اس قدر خوشنما اور نظر فریب پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے کہ دامن کو الجھانے والے کانٹوں کو بے نقاب دیکھنا بڑا دقت طلب ہے۔ اس لئے جو کچھ اس حصۂ مضمون میں عرض کیا جائے گا اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان خیالات کو جو پہلے سے آپ کے قلب و دماغ پر مستولی ہیں تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیجئے اور یوں خالی الذہن ہو کر' ٹھنڈے دل سے بنگاہ تفکر و تدبر غور

کیجئے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ یہ تاکید اس لئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ مسئلہ زیرِ نظر جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک بھی ہے۔ لہٰذا اہمیت و نزاکت کی اس کشمکش میں قلب و دماغ میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔ اور اگر آپ ان جذبات کی رو میں بہہ گئے جو فضا میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں تو آپ حقیقت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ نگہِ بصیرت سے بھی کام لیجئے اور دعا کیجئے کہ اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ دین کس چیز کا نام ہے، وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ ''قرآن و حدیث'' کا مجموعہ۔ یہ چیز ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس کے متعلق بھی کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ گویا یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جو کبھی محلِ نظر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس میں کسی تردد کی گنجائش ہی نہیں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں، یہ چیز بھی اس قابل ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے اور سوچا جائے کہ جو کچھ عام طور پر مشہور ہو چکا ہے وہ درحقیقت ایسا ہے یا نہیں۔ تو اس آواز کے خلاف کس قدر ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور مخالفت کی کتنی قوتیں ہوں گی جو اس کے مقابل ہجوم کر کے چلی آئیں گی۔ اب اگر آپ اس ہنگامہ و ہجوم کے شور و غوغا میں کھو گئے تو پھر آپ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسلئے آپ کو نہ صرف اپنے داخلی جذبات کے غیر محسوس طوفان ہی کا مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ ان خارجی ہنگاموں کے غلغلہ انداز سیلاب کو بھی برداشت کرنا پڑے گا اور حق یہ ہے کہ جب تک اس قدر شدید جدوجہد نہ کی جائے عروسِ حقیقت بے نقاب جلوہ پیرا نہیں ہوتی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ سب متفق ہوں گے، یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو، ظنی اور قیاسی نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ ان اللہ علیم بما یفعلون (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوائے کسی اور چیز کی اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اس کے رسول نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیئے ہیں؟

پہلے قرآن کریم کو لیجئے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کتابِ حق ہے۔

والذی او حینا الیک من الکتاب ھو الحق..... (۳۱/۳۵)۔

جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ (بالکل) حق ہے۔.....!

اس کتابِ عظیم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے! ذالک الکتاب لا ریب فیہ۔ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، یہ سراسر حق ہے، یقینی ہے۔ ظنی اور قیاسی نہیں، ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ تو ہے نفس کتاب کے متعلق۔ اب یہ کہ یہ یقینی شئے مسلمانوں کو ملی کیسے اور ان کے پاس رہے گی کس حیثیت سے۔ سو ظاہر ہے کہ قرآن کریم حضورؐ پر نازل ہوا اور اس

کے متعلق جمع وتدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔

ان علینا جمعه و قرآنه (۷۵/۱۷)۔

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور صرف جمع وتدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردوبدل اور کسی نوعیت کی تحریف و الحاق نہ ہوسکے۔ فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لئے جناب نبی اکرم ﷺ کو ارشاد ہوا کہ

یاایها الرسول بلغ ما انزل الیک (۵/۶۷)

اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچادو۔

حضور ﷺ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یعنی صحابۂ کبارؓ کی ایک جماعت تھی جنہیں قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھایا جاتا تھا۔ ہزاروں حفاظ تھے جنہیں لفظاً لفظاً یاد کرایا جاتا تھا۔ پھر حضور ﷺ ان کا یاد کردہ خود سنتے تھے اور ان کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے۔ چنانچہ دنیا سے تشریف لے جانے سے پیشتر حضورؐ نے کامل اطمینان کرلیا کہ پیغامِ خداوندی جو ان پر نازل ہوا تھا وہ اپنی کامل ومکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا محفوظ ہے اور ہزاروں حفاظ کے سینوں میں مصئون۔ حجتہ الوداع کے عدیم النظیر خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا اقرار لیا کہ آپ نے اس پیغامِ الٰہی کو ان تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ قرار دیا کہ تو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت یوں ادا کردیا ہے۔ اس انتظام واطمینان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سند نازل ہوئی کہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔ (آج کے دن ہم نے دین تمہارے لئے مکمل کردیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت کا اتمام کردیا۔) نبی اکرمؐ کے بعد خلفاء راشدین (رضی اللہ عنہم) نے حفاظت قرآن کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ حضورؐ نے قرآن کریم کو متفرق نوشتوں پر لکھا ہوا چھوڑا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت زید کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس نے ان متفرق نوشتوں کی شیرازہ بندی کرکے قرآن کریم کو ایک جگہ کتابی شکل میں منوط کردیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اس مصحف اول کی بہت سی نقول مختلف مراکز اسلامیہ میں بھجوائیں جن میں سے کئی ایک نسخے بحمدہٖ صدیوں تک محفوظ چلے آئے۔ اس کے بعد یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر اس انداز سے محفوظ چلا آرہا ہے کہ اپنے تو اپنے غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے انہیں دیا تھا۔ اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اس لئے اس کا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ ہے یقینی چیز جس کے دین ہونے میں ظن و قیاس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حصہ کو لیجئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے، یعنی مجموعۂ احادیث۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآن کریم ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا نہ ان کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسول ﷺ کا اس باب میں کیا طرز عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے' اس لئے کہ احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال واعمال واحوال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر یہ جزو دین تھیں تو جس طرح آپنے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا' زبانی یاد کرایا' لوگوں سے سنا' دھرایا اور ہر طرح سے اطمینان فرمالیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ منصب رسالت کا یہی تقاضا تھا اور بہ حیثیت رسول حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں امت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا' برعکس اس کے اکثر کتبِ احادیث میں ہی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القران۔ ومن کتب عنی غیر القران فلمہ*(صحیح مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز لکھی ہو اسے مٹا ڈالے۔

(*اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب تم احادیث کو یقینی نہیں سمجھتے تو ان کو بطور دلیل کے پیش کیوں کرتے ہو؟ سو واضح رہے کہ یہ چیز بطور دلیل ان کے لئے پیش کی جاتی ہے جو انہیں یقینی مانتے ہیں تا کہ وہ دیکھ لیں کہ خود احادیث بھی ان کے مسلک کے خلاف جاتی ہیں۔ ورنہ جہاں تک ہمارے لئے حجت شرعیہ اور اطمینان قلب کا تعلق ہے الحمدللہ کہ اللہ کی کتاب کافی ہے۔ حسبنا کتاب اللہ اور اس کے بعد تاریخ میں وہ چیزیں جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔)

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرمادی تھی کہ وہ چاہیں تو احادیث لکھ دیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کون سی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا تو قرآن کریم لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی! اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا تو لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر ان سے سن لیا جاتا تھا اور اسکی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کچھ احادیث کسی نے اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو امت کے لئے وہ سند نہیں ہوسکتیں' تاوقتیکہ نبی اکرمؐ ان احادیث کو سن کر ان کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرمادیتے اور پھر وہی احادیث قرآن کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمائیے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو رسول اللہ انکی حفاظت کا کچھ انتظام بھی نہ کرتے؟

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلمبند ہوئی

تھیں۔مثلاً وہ تحریری معاہدات' احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمال کے نام بھیجے۔لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱) پندرہ سو صحابہ کے نام (ایک رجسٹر میں)

(۲) مکتوبات گرامی جو حضورؐ نے سلاطین وامراء کے نام لکھے۔

(۳) تحریری احکام' فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے ان کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی بعد میں یہ اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود رہیں۔لہٰذا کوئی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے عہد مبارک میں لکھی گئی ہو اور وہ اسی شکل میں ہمارے پاس موجود ہو۔خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (امت کے لئے) کیا چھوڑا ہے' تو آپ نے کہا کہ ماترک الا مابین الدفتین۔یعنی قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا۔(بخاری جلد دوم کتاب فضائل القرآن)۔

حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ان برگزیدہ حضرات نے قرآن کریم کی نشر واشاعت اور حفاظت وصیانت میں جو کوششیں کیں ان کا اجمالی ذکر اوپر آچکا ہے۔اب دیکھئے کہ احادیث کی جمع وتدوین وترویج وتحفظ میں ان کا طرز عمل کیا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ

> حضورؐ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا۔اس لئے تم لوگ رسولؐ اللہ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو۔جو شخص تم سے حدیث پوچھے اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے' اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام۔

یہیں تک نہیں بلکہ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ بھی تھا لیکن آپ نے اسے یہ کہہ کر جلا دیا کہ مجھے خوف ہے کہ میں مرجاؤں اور یہ محفوظ رہ جائے۔ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے ان پر وثوق ہے لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں۔

حضرت عمرؓ نے تو اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔قزعہ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں' تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے درے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابودرداؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرت روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا (ان تمام روایات کے لئے دیکھو تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے کہ ان روایات کی حجت کو محل نظر قرار دے دیا جائے' حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی

اورعمل رسول اللہ کے عین مطابق ہیں' بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا ان کی زیرنگرانی مدون کیا گیا ہو۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے سامنے تو ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش بھی کیا گیا کہ احادیث کو لکھ لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کامل ایک ماہ تک اس معاملہ میں استخارہ کیا لیکن اس کے بعد فرمایا ''میں نے تحریر حدیث کا ذکر کیا تھا لیکن جب میں نے غور کیا تو اس قوم کا خیال آیا جس نے خود ایک کتاب لکھی اور اس پر اس قدر متوجہ ہوئی کہ خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ اس بناء پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا (علامہ خضری کی کتاب فقۂ اسلامی میں یہ روایت تنویر الحوالک کے حوالہ سے نقل ہے)۔ (طبقات ابن سعد)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کو مرتب کر کے مختلف ممالک میں اس کے نسخے بھجوائے تھے خلافت کی زیرنگرانی احادیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر کے کیوں نہ شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسولؐ اللہ کے بعد خلافت راشدہ میں بھی جمع و تدوین حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس بات کا کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا۔ ۱۰۰ھ کے قریب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (اموی خلیفہ) نے خلفائے بنی امیہ کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا۔ لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدون صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورۂ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتب احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرون اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ خیال پیدا ہونا بھی چاہئے تھا۔ مسلمانوں کے لئے دنیا میں عزیز ترین یاد اسی عہد مبارک کی ہے جس میں نیر اسلام کا طلوع ہوا اور اس کی ضیا پاشیوں سے تمام دنیا بقعۂ نور بن گئی۔ اس دور میں کتب سیرت کی تصنیف کی ابتدا ہوئی۔ ان تصانیف کا مسالہ (Material) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ یہ باتیں اس تمام عہد کو محیط تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمٹایا اور صرف ان ہی باتوں کو اکٹھا کیا۔ جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے (احادیث کے معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت دستیاب ہوسکتا ہے امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتبِ احادیث مدون ہوئیں۔ عہد عباسی میں اسلامی علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتب احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتب احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) ہیں۔ امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔

اسی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتب احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔

تدوینِ کتبِ احادیث کی اس مختصر سی تاریخ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ احادیث کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی دین کا جزو ہوتیں تو ظاہر ہے کہ خود نبی اکرمؐ احادیث کا مستند مجموعہ لکھوا کر چھوڑ جاتے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین (خلفائے راشدہؓ) اس مجموعہ کے مصدقہ نسخے مختلف مقامات میں بھیجتے۔ یہی مجموعہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ دین کا جزو بنا رہتا۔ لیکن ایسا تو کسی نے نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح انفرادی طور پر بعض لوگوں نے کتب تاریخ تصنیف کیں' اسی طرح کتب احادیث کو مدون کیا۔ اب خیال فرمائیے کہ دین بھی ایسی چیز ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اور نبی اکرمؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ امام بخاریؒ یا ایسے دیگر حضرات نے ان باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں موجود نہ تھیں' اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو دین کا آدھا حصہ تو (معاذ اللہ) بالکل کھویا ہوا تھا۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کی سند قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسول گرامی ﷺ کہ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسولؐ نے نہ آنا ہو وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے۔

پھر ایک دوسری صورت بھی تھی۔ جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا اگر لوگ نبی اکرمؐ کی احادیث کے الفاظ کو یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے تا آنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لئے جاتے تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کتبِ احادیث کا مجموعہ ایک یقینی چیز ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہوئی۔ احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری اور مسلم سمیت) ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اس کے الفاظ وہی ہیں جو رسولؐ اللہ نے فرمائے تھے۔ اس بات پر پھر غور کیجئے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس کے الفاظ رسولؐ اللہ کے الفاظ ہوں۔ تمام احادیث' روایات بالمعنیٰ ہیں۔ یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسولؐ اللہ سے کچھ سنا' اس نے جو کچھ سمجھا' اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا' اس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لائیے اس صورتِ حالات کو۔ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں' مہینہ دو مہینہ' سال دو سال نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے اور اس کے بعد لوگوں میں اس قسم کی پھیلی ہوئی باتوں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان باتوں کو پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرمؐ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جس قدر تعلق ہو گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آپ ایک کمرہ میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کیجئے' اس کے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوئی جب پھر آپ تک پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس میں اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سن رہے ہیں اس میں کس قدر فرق ہوتا ہے اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے سے یہ باتیں آگے منتقل ہوئی ہوں تو ان میں جو اصلیت باقی رہے گی وہ ظاہر ہے۔ جو بات کانوں کے راستے قلب تک پہنچے اور پھر قلب سے زبان کی راہ سے باہر آئے۔ اس پر قلب انسانی کی رنگینی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آمیزش ارادۃً ہی ہو۔ غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز سے اس کا اثر اس میں ضرور

آ جائے گا۔ ارباب جرح وتعدیل نے یہ ضرور کیا کہ ایک حدیث میں جس قدر راویوں کا سلسلہ آتا ہے ان کے متعلق بڑی کدو کاوش سے یہ تحقیق کی کہ وہ ثقہ تھے، پرہیزگار تھے، متقی تھے لیکن یہ امر بالکل بدیہیات سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لئے مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت بھی اچھی ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں حقائق و معارف کے سمجھنے کی کما حقہٗ استعداد ہو اور پھر انہیں بعینہٖ اسی طرح، لیکن اپنے الفاظ میں آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جائے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ اپنے گردو پیش نظر دوڑائیے اور ان لوگوں کو دیکھئے اور دیکھئے کہ جنہوں نے عمر بھر جھوٹ نہ بولا ہو، صوم وصلوٰۃ کے شدت سے پابند ہوں، متقی اور پرہیزگار بھی ہوں، اور اس کے بعد پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ انمیں کتنے آدمی ایسے ہیں جن میں منتقل کرنے کی استعداد بھی ہے۔ خود یہ حقیقت کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کو اس کے اپنے الفاظ میں محفوظ رکھنے کا اس قدر محکم انتظام فرمایا اس امر کی دلیل ہے کہ دین کے معاملہ میں صرف مفہوم کا آگے منتقل ہوتے جانا قابل اطمینان نہیں ہے۔ اس قسم کی چیز کبھی یقینی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ایک آیت قرآنی کو پڑھتے ہیں تو پورے حزم ویقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ قال اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا)۔ لیکن جب کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو اس کے بعد یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ ''او کما قال رسول اللہ'' (یعنی یوں، یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہو)۔ یہ چیز بعد کی وضع کردہ نہیں۔ بلکہ خود صحابہؓ کا بھی یہی انداز تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ وہ جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو کانپ اٹھتے تھے اور کہتے تھے: اس طرح یا اس کے مثل، یا اس کے قریب، یا، یا (مسند دارمی) حضرت عمرؓ اسی خوف سے حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں مجھ سے حدیث کی روایت کرنے میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔ (انساب الاشراف از بلاذری) یہ چیزیں اس پر شاہد ہیں کہ آج حدیث کو دین ماننے والوں کو بھی اس امر کا یقین نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا تھا یا کچھ اور۔ اسی لئے ان کے ہاں بھی احادیث کو اقوال رسول اللہ ﷺ (حضورؐ کی باتیں) نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اقوال منسوب الی الرسول کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو جمع حدیث کے وقت رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ کہئے کہ ایسی چیز کبھی یقینی کہلا سکتی ہے؟ اور جب یہ اس قدر ظنی ہے تو پھر دین کیسے بن سکتی ہے؟

یہاں تک تو ہم نے اس مفروضہ کے ماتحت لکھا ہے کہ جو کچھ راویوں نے بیان کیا اس میں انہوں نے دانستہ کسی قسم کی تحریف نہیں کی۔ جس چیز کو دیانتداری سے سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آئی ہے اسے اپنی سمجھ کے مطابق دیانتداری سے آگے منتقل کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ اس اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ہزاروں ایسے منافق پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے لباس میں اپنی ظاہرداری کے تقویٰ اور ثقاہت کا سکہ جما کر لاکھوں حدیثیں وضع کیں اور انہیں ذاتِ رسالتمآب ﷺ کی طرف منسوب کر کے آگے منتقل کر دیا۔ ان میں بعض کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا اور انہوں نے اپنی ان خبیثانہ حرکات کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن کتنے ایسے ہوں گے جن کا راز افشا نہ ہو سکا۔ پھر اتنا ہی نہیں۔ ہزاروں ایسے مسلمان تھے جو نہایت نیک نیتی سے اس لئے حدیثیں وضع کرتے تھے کہ لوگوں میں دین کا شوق پیدا ہو۔ مثلاً کسی بات کو انہوں نے اچھا سمجھا اور بجائے اس کے کہ اسے اپنی طرف سے کہیں اسے جناب رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے پیش کر دیا

کہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور اثر زیادہ ہو۔ اس قسم کی وضع شدہ احادیث کا ٹھکانا ہی نہیں (تفصیل کے لئے موضوعات ملا علی قاری دیکھئے)۔ ارباب جرح وتعدیل نے معیار ثقاہت وتقویٰ اور پرہیز گاری قرار دیا تھا۔ اس قسم کے واضعین حدیث کے تقویٰ و پرہیزگاری میں کسے شبہ تھا۔ لہٰذا ان کی ثقاہت مسلم تھی۔ یہ چیزیں بھی اس طرح آپ کا دین بن گئیں۔ آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو جو قرآن نے ظنی اور قیاسی قرار دے کرنا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے تو اس کی یہی وجوہات ہیں۔ اول تو وہ ان الفاظ میں محفوظ نہیں رہ سکی تھیں جن میں وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد ان کے جامعین نے ان صحائف کو ادھر ادھر کی روایات کی بناء پر اکٹھا کیا تھا۔ پھر ان میں وہ روایات بھی شامل ہوگئی تھیں جو لوگوں نے اس دوران میں وضع کی تھیں نیز وہ کچھ بھی جو خود ان کے ارباب مذاہب' احبار و رہبان نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ان میں شامل کر دیا تھا۔ اب اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ جو اس طرح مدون ہوا تھا قرآن کے نزدیک قابل اعتبار نہیں قرار پا سکتا تو فرمائیے کہ احادیث کے مجموعے' جو بالکل اسی طرح سے مرتب ہوئے ہیں' کس طرح یقینی قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے متعلق اربابِ جرح و تعدیل نے بڑی جانچ پڑتال کی۔ لیکن یہ تمام کوششیں انسانی تھیں۔ ان حضرات کی کوششیں لائق ہزار تحسین سہی' لیکن ان کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ انہوں نے اپنے سے پیشتر سینکڑوں برسوں کے انسانوں کے متعلق تحقیق وتفتیش کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا ان حضرات کو خدائی صفات کا حامل سمجھ لینا ہے۔ کتبِ احادیث کے متعلق زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تاریخ کی دوسری کتابوں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ لیکن بالآخر یہ ہیں تو انسانی کارنامے۔ خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے ساتھ نہیں۔ اب جامعین حدیث کو اور علماء جرح وتعدیل کو تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی ہر بات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لے جانا ہے۔ اور حضرات رواۃ کے متعلق' خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول کیوں نہ قرار دیئے گئے ہوں' یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا ان کو معصوم اور منزہ عن الخطاء قرار دینا ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں' یعنی جو لوگ ان کے سامنے موجود تھے ان سے سنیں اور اس کے بعد اپنی بصیرت کے مطابق ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو ناقابل اعتبار سمجھ کر مسترد قرار دے دیا اور بقایا تین ہزار کے قریب اپنی کتاب میں درج کر لیں۔ لیکن غور فرمائیے کہ امام بخاریؒ کے پاس کون سی سند تھی جس کے مطابق انہوں نے جن تین ہزار احادیث کو اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا ہے کہ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ کتنے ہی بڑے عالم سہی' تھے تو بالآخر انسان اور ایک انسان کے متعلق سمجھ لینا کہ اس کی تحقیق کا نتیجہ ایسا ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور وہ تنقید کی حد سے بالا ہے' سوائے شخصیت پرستی کے اور کیا ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو اس میں عام طور پر رجحانات قلبی کا شائبہ آ جائے گا۔ اور قلبی رجحانات میں عقیدے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ امام بخاری کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں' اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظم کو ثقہ نہیں قرار دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں' چونکہ امام اعظم کوفہ کے رہنے والے تھے' اس لئے تمام کوفہ والے غیر معتبر' ناقابل روایت حدیث قرار پا

گئے اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے اس لئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے اور فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سو حدیثوں میں ننانوے چھوڑ دو۔ جو ایک لو تو اسے بھی مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدہ کے اختلاف کی بناء پر دو جلیل القدر امام یعنی امام ابوذرعہ اور امام ابوحاتم نے خود امام بخاری کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے اور ان سے روایت ترک کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ امام بخاریؒ کو محدث الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ان ائمہ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں۔ عقائد کے اختلاف سے احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ ہمارے سنی اور شیعہ جماعتوں کا وجود ہے۔ سنی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلہ روایت تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلہ روایت بھی اسی طرح تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سنی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لا سکتے کہ وہ بزرگان دین جو ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورت معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث امت کو ملیں جو سنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہئے کہ کون سی تعلیم رسولؐ اللہ کی قرار دی جائے اور اسے جزو دین سمجھا جائے اور کون سی غلط! اور اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ارباب جرح وتعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ تو صاف پارٹی بازی ہے' انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ پھر ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے۔ خود امام بخاریؒ (اور دوسرے جامعین احادیث) جن بزرگوں کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات مردود ٹھہراتے ہیں خود ان ہی کی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث درج کر دیتے ہیں۔ دیکھئے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی وتدریب الراوی وغیرہ۔

یہ تو ہیں خارجی شہادات جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث نہ خود نبی اکرمؐ کے نزدیک جزو دین تھیں نہ صحابہ کبارؓ نے انہیں ایسا سمجھا اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ رسول اکرمؐ کے الفاظ ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر داخلی شہادات خود ان مجموعوں کے مشمولات (Contents) ہیں۔ ان میں کس کس قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کے ذکر سے میری روح کانپتی ہے' ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرت ناک معلوم ہوگا اور معلوم ہونا بھی چاہئے۔ اس لئے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزت وعظمت قریب قریب قرآن کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق ایسی بات یقیناً تحیر انگیز ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ آپ نہ میری سنئے اور نہ کسی اور کی' بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں نے کیا لکھا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ سے کہا جائے گا کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمتہ اتنے پائے کے امام' پھر ان کے بعد ایک ہزار سال کے عرصے میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام و بزرگان کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں

نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے' کہئے ایسی کتاب میں (پناہ بخدا) اس قسم کی بات ہوسکتی ہے۔ اس کے جواب میں میں پھر یہی عرض کروں گا کہ ان بزرگانِ سلف (علیہم الرحمتہ) کی عزت و توقیر بجا اور درست۔ لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اسے خود کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں۔ آج کل تو بخاری شریف کا اردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ آپ عربی نہیں جانتے تو اردو ترجمہ ہی دیکھ لیں اور اس کے بعد علیٰ وجہ البصیرت فیصلہ فرمائیں کہ میں نے درست لکھا ہے یا نہیں۔ آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس ذاتِ اقدس واعظم کی طرف جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا مظہر اتم تھی۔ وہ ہستیِ گرامی مرتبت (فداہ ابی وامی) جو علم و ایقان کے افق اعلیٰ پر جلوہ افروز تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس فخر موجودات رحمتہ اللعالمینؐ کی ذات عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئیں ہیں۔

پھر کہا یہ جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنی باتیں ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور ہمارا روزمرہ کا کاروبار ہی اس بات پر چلتا ہے۔ دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں حالانکہ وہ بھی ظنی ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں۔ پھر احادیث سے کیا چڑ ہے کہ آپ انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنی ہیں۔

دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تاریخ یا اخبارات ہمارے لئے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا جی چاہے ایک واقعہ کو صحیح تسلیم کروں اور اگر اس کے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہہ کر رد کر دوں کہ مجھے اس کی صحت پر شبہ ہے۔ برعکس اس کے احادیث ہمارے لئے دین قرار دی جاتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ اگر مجھے ان کے متعلق ذرا سا بھی تردد پیدا ہو جائے تو ایمان کی خیر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ تو میں چاہوں تو اسے صحیح تسلیم کروں نہ چاہوں تو اسے مسترد کر دوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عائد ہوتی ہے نہ میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آئے کہ ''حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا'' تو چونکہ حدیث کو جزو دین قرار دے دیا گیا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہو گیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبی کو (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی' تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں۔ لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھیں گے کہ ''جب ملک الموت حضرت موسےٰؑ کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت موسےٰؑ نے ان کے ایک ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی'' تو آپ کو اس واقعہ کو صحیح ماننا پڑے گا کہ اس میں شک کرنے سے آپ دین میں شک کر رہے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ دنیا کی دوسری ظنی چیزوں کے تسلیم کرنے میں اور ایک ایسی ظنی چیز کے تسلیم کرنے میں جسے آپ کے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو' کتنا بڑا فرق ہے۔ ہم خود یہی کہتے ہیں کہ چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنی ہیں اس لئے یہ دین نہیں قرار پا سکتیں۔ ان کی حیثیت

تاریخ کی ہے اور تاریخ تنقید کی حد سے بالاتر نہیں ہوتی۔

اس مقام پر یہ سوال ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ جب قرآن کریم میں ''خدا اور رسول'' کی اطاعت کا حکم ایسی تاکید سے آیا ہے تو اگر احادیث ظنی ہیں تو پھر رسول کی اطاعت کس طرح سے کی جائے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ایک مرتبہ پھر ''خدا اور رسول'' کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے لانا ہوگا جو میرے متعدد مضامین میں آپ کی نگاہوں سے گزر چکا ہے۔ یعنی ''خدا اور رسول'' سے مراد وہ مرکز ملت ہے جو دنیا میں خدائی قوانین نافذ کرے۔ رسول اللہؐ جہاں ایک رسول تھے (یعنی خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچانے والے) وہیں آپ اس حکومت خداوندی کے اولیں مرکز بھی تھے۔ لہٰذا آپ کی اطاعت، جو بہ حیثیت امیر ملت اور مرکز امت کی جاتی تھی ''خدا اور رسول'' کی اطاعت تھی۔ حضورؐ کے بعد مرکز ملت خلیفۃ الرسول قرار پا گئے۔ اس وقت ''خدا اور رسول'' خلیفۃ المسلمین کی اطاعت تھی۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت جو آپ بہ حیثیت امیر المؤمنین صادر فرماتے تھے۔ عین اطاعتِ ''خدا اور رسول'' تھی۔ یہی سلسلہ آگے منتقل ہوتا رہا۔ تا آنکہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور پھر سرے سے یہ شیرازہ ہی منتشر ہوگیا۔ اس وقت ''خدا اور رسول'' کی اطاعت کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب خدا کی اطاعت کا مفہوم لیا گیا قرآن کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا مفہوم احادیث کی اتباع۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مفہوم مسلمانوں کے دور تشتت وانتشار کی پیداوار ہے۔ نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ میں ''خدا اور رسول'' کی اطاعت سے مفہوم مرکزِ ملت کے فیصلوں کی اطاعت تھا اور بس! قرآن کریم نے جن احکامات کی تفاصیل خود بیان کر دی تھیں ان میں نہ رسولؐ کو ردوبدل کا حق حاصل تھا نہ حضورؐ کے جانشینوں کو۔ لیکن جن معاملات کے متعلق قرآن کریم نے محض اصولی احکام دیئے ہیں ان کی جزئیات مرتب کرنے کا کام مرکزِ ملت کے ذمہ تھا۔ ان جزئیات کا قرآن کریم میں بیان نہ ہونا اور جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں ان کا قرآن کی طرح محفوظ نہ رکھنا اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ ان جزئیات کو غیر متبدل اور اٹل قرار دینا نہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت۔ خدا اور اس کے رسول کے نزدیک ان میں مختلف زمانوں میں، بہ اقتضائے حالات، ردوبدل ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ردوبدل انفرادی طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مرکز ملت ہی ایسا کرسکتا ہے۔ آج ہم میں مرکزِ ملت علیٰ منہاجِ نبوت موجود نہیں اس لئے ہماری زندگی بھی اسلامی نہیں اور اسی لئے طرح طرح کے اعتراضات اور شبہات ہمارے قلب و دماغ کے لئے وجہ پریشانی اور باعثِ تردد بن رہے ہیں۔ مرکزِ ملت قائم ہو جائے تو ان تمام امور کا تصفیہ خود بخود ہو جائے۔ یہ مرکز قرآن اپنے سامنے رکھے گا۔ پھر ان امور کے لئے جن کی جزئیات قرآن نے بیان نہیں کیں، اپنے پیش رو مراکز ملت (Predecessors) کے فیصلوں کا مطالعہ کرے گا اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ان پر غور وخوض کرنے کے بعد، اگر وہ انہیں علیٰ حالہ رکھنا چاہے گا تو اسی طرح رہنے دے گا اور اگر کہیں ردوبدل کی ضرورت سمجھے گا تو ایسا بھی کر دے گا۔ ملت کے لئے خدا اور رسول کی اطاعت مرکز کے ان فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوگا۔ چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یہ قرآنی نظام زندگی اوجھل ہو چکا ہے اس لئے مرکز کی صحیح پوزیشن بھی ان کے سامنے نہیں رہی اور اسی لئے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجائے تو پھر احادیث کا صحیح مقام بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ نے کیوں

احادیث کے مجموعے مرتب کر کے امت کو نہیں دیئے تھے۔ وہ امت کو صرف دین دینا چاہتے تھے اور دین' خدا کی کتاب کے اندر ہے یا ان جزئیات کے اندر جو کتاب اللہ کے اصولوں کے تحت' ہر زمانہ میں' قرآنی احکام نافذ کرنے والی حکومت وضع اور نافذ کرے۔ لہٰذا اگر یہ کسی طرح ثابت بھی کر دیا جائے کہ فلاں روایت یقینی طور پر سچی ہے تو بھی اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ حضورؐ کے زمانۂ مبارک میں دین کے فلاں گوشہ پر کس طرح عمل کیا گیا تھا۔ اگر ہمارے زمانہ کا مرکزِ حکومتِ قرآن سمجھے کہ اس عمل میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں تو اسے علیٰ حالہٖ رائج کر دے اور اگر سمجھے کہ ہمارے زمانہ کے اقتضات اس میں ردوبدل چاہتے ہیں تو اس میں ردوبدل کر دے۔ یہ ہے احادیث کی صحیح دینی حیثیت۔

تجزیہ: تصریحاتِ بالا سے یہ امور واضح ہو گئے ہوں گے کہ:

(۱) دین یقینی ہونا چاہئے۔ ظنی شئے دین نہیں بن سکتی۔

(۲) یقینی چیز قرآن کریم ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا اور نبی اکرم ﷺ نے اس کے الفاظ محفوظ کر کے اسے امت کے پاس چھوڑا' اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ اس کے الفاظ مختلف نوشتوں میں اور حفاظ کے سینے میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اسی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

(۳) قرآن کریم کے علاوہ نبی اکرمؐ نے کسی چیز کو لکھوایا نہ یاد کرایا' نہ سنا' نہ اس کی صحت کی کوئی سند عطا فرمائی۔ اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی نہ احادیث کا کوئی مجموعہ تیار کرایا نہ کوئی جماعت پیدا کی جو انہیں یاد کرے۔ برعکس اس کے ایسی شہادتیں پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ اور ان کے جانشینوں نے اس کی مخالفت کی۔

(۴) جب لوگوں کو صدر اولیٰ کی تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو بعض حضرات کو اس امر کا بھی خیال پیدا ہوا کہ خاص وہ اقوال و احوال جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں' انہیں الگ کتابوں میں جمع کر دیا جائے ان ہی کا نام کتبِ احادیث ہے۔

(۵) احادیث کی وہ کتابیں جنہیں مستند ترین سمجھا جاتا ہے (یعنی صحیحین) حضورؐ کے قریب دو ڈھائی سو برس کے بعد مدون ہوئیں۔ (صحاح ستہ میں سے اولین کتاب بھی ڈیڑھ سو برس بعد مدون ہوئی)۔ ان کا ذریعہ تدوین وہ روایات تھیں جو اس وقت لوگوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

(۶) یہ روایات قرآن کریم کی طرح لوگوں میں لفظاً منتقل ہو کر نہیں آئی تھیں' بلکہ ان کا مفہوم منتقل ہو کر آتا رہا۔

(۷) کتب احادیث میں کوئی حدیث بھی ایسی نہیں جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اس کے الفاظ خود رسولؐ اللہ کے الفاظ ہیں۔

(۸) حضرات جامعین احادیث کے بعد اربابِ جرح و تعدیل نے یہ فیصلے کئے کہ فلاں فلاں راوی معتبر ہے اور فلاں فلاں غیر معتبر۔ یعنی انسانوں نے اپنے سینکڑوں برس پہلے کے انسانوں کی ثقاہت کے متعلق فیصلے کئے اور انہی فیصلوں کے مطابق احادیث صحیح و ضعیف قرار پائیں۔

(۹) ان مجموعوں میں ایسی باتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں' جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور انبیاء کرامؑ کی شان میں طعن پایا جاتا ہے' جن سے بصیرتِ اباء اور عقل سلیم بغاوت کرتی ہے اور جن میں ایسی ایسی چیزیں ملتی ہیں جنہیں آپ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اس کے لئے آپ زیادہ نہیں تو صرف ایک صحیح بخاری کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ یہ درست ہے یا نہیں۔

(۱۰) یہ ہیں وہ مجموعے جنہیں قرآن کریم کے ساتھ دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے' بلکہ یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ ''احادیث قرآن کریم کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن احادیث کا محتاج ہے''۔ (امام اوزاعی) اور یہ کہ ''احادیث قرآن پر قاضی ہیں۔'' (امام یحییٰ) یعنی قرآن اور احادیث میں اگر تعارض ہو تو جو فیصلہ احادیث دیں وہ قابل قبول ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کے صحیح ہونے کا یہ اصول بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کو دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اصول تبرکاً داخل رہا۔ عملی طور پر اس سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ عملاً یہی اصول کارفرما رہا کہ احادیث کے راوی کیسے ہیں۔ یعنی اگر ایک حدیث کا سلسلۂ اسناد (راویوں کا سلسلہ) معتبر قرار دے دیا گیا ہو تو وہ حدیث صحیح قرار پا جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ

(۱) یقینی چیز قرآن مجید ہے اور دین اسی کے اندر ہے۔

(۲) احادیث کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ لہٰذا یہ مجموعے تنقید کی حد سے بالاتر نہیں۔ جس طرح امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے قریب تین ہزار کا انتخاب فرما کر بقایا مسترد کر دی تھیں۔ اسی طرح ان کے مجموعے سے بھی ایسی احادیث الگ کی جا سکتی ہیں جو دین کے معیار پر صحیح نہیں اترتیں' اس لئے کہ یہ تسلیم کر لینا کہ راویوں نے کسی ایک بات کو صحیح نہیں سمجھا اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ ایک ایسی چیز کو ذاتِ رسالتؐ مآب کی طرف منسوب کر دیا جائے جو ان کے شایانِ شان نہ ہو۔ اس قسم کی تنقید و تنقیح کے بعد احادیث کے ان مجموعوں سے ہم دین کے سمجھنے میں اور جزئیات کی تشکیل میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ دین' یہ پھر بھی قرار نہیں دی جا سکتیں۔

(۴) یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ پھر اس حقیقت پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرم ﷺ قرآن ہی کا اتباع کرتے تھے اس لئے حضورؐ کا کوئی قول یا عمل' قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ان دو اصولوں کے بعد' احادیث کو پرکھنے کا نہایت عمدہ معیار ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جو حدیثیں قرآن کریم کے مطابق ہوں ان کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسولؐ اللہ کی حدیث ہو سکتی ہے۔ لیکن جو حدیث قرآن کے مطابق نہ ہو اسے کبھی رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ قرار دیئے جائیں۔ جو احادیث اس طرح پرکھی جائیں ان کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں کی قابل اعتماد تاریخِ دین ہے۔

☆☆☆

اس وقت تک ہم نے شخصیت پرستی کے جس قدر مظاہر پیش کئے ہیں ان میں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ انہیں اپنی اطاعت کے لئے کسی نہ کسی سند کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اب ہم شخصیت پرستی کے ایک ایسے گوشے کی طرف آتے ہیں جہاں مطاع اور مطوع کے لئے کسی قسم کی سند کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ گوشہ پیر پرستی کا' اندھی اطاعت اور انسانی غلامی کا شدید ترین مظہر ہے۔ اس میں پیر کا ہر حکم' خدا کے حکم کی طرح واجب التسلیم ہوتا ہے۔ نہیں! بلکہ خدا کے حکم سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اگر پیر کا حکم خدا کے حکم کے خلاف ہوتا تو اطاعت پیر کے حکم کی ہوتی' خدا کی نہیں۔ اس لئے کہ پیر پرستی کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ ''ہر روٹھے گُرمیل دے گُر روٹھے میلے کون'' (اگر خدا ناراض ہو جائے تو اسے بذریعہ مرشد منایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مرشد روٹھ جائے تو اسے کون منا سکتا ہے) لہٰذا اگر کبھی خدا اور مرشد میں سے ایک کو رکھنے اور دوسرے کو چھوڑنے کی مجبوری لاحق ہو جائے تو ''مسلکِ راہِ طریقت'' یہ ہے کہ ''ہر تیا گوں گُرنا ہیں

تیاگوں‘‘ (خدا کو چھوڑ دینا چاہئے‘ مرشد کو نہیں چھوڑنا چاہئے) مرشد کے پاس اپنے احکام کی اطاعت کے لئے سند صرف ’’علم لدنی‘‘ کی ہوتی ہے۔ جو علم و شہادت کی تمام شرائط سے بے نیاز ہے۔ مرشد اپنا علم براہ راست ’’خدا اور رسول‘‘ سے حاصل کرتا ہے اور یہ وہ علم ہے جو نہ خدا کی کتاب میں ہے اور نہ رسولؐ کی طرف منسوب کردہ سنت میں۔ وہ قرآنی آیات کا مفہوم بھی ایسا بیان کرتا ہے جو نہ عربی زبان کی رو سے درست ہو اور نہ ہی تعلیم قرآن کے مطابق۔ اس مفہوم کے لئے سند‘ اس کا کشف ہے جس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ جس وقت آپ نے کسی کی بیعت کر لی بس اس کے بعد علم و عقل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی آپ پر حرام ہو گیا۔ اب پیر کا ہر حکم بلا سند خدا کا حکم ہے۔ اس کے ایک لفظ پر بھی تنقید نہیں کی جا سکتی لب کشائی تو ایک طرف دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ پیر‘ دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے‘ حاضر و غائب‘ واقف ہے۔ وہ تمام خدائی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر وہ ناراض ہو گیا تو دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو گئیں۔ اس کے بعد کہیں ٹھکانا نہیں‘ کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر نہ کوئی انسان اس کی مدد کر سکتا ہے اور نہ خدا ہی۔ ہم اس وقت نہ تو تصوف کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ بتانا مقصود ہے کہ خود تصوف ہی کس قدر غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام‘ جو انسان کو ہر قسم کی انسانی اطاعت سے آزاد کرانے آیا تھا‘ اسی اسلام کے نام پر کس طرح انسانی غلامی کی شدید اور بدترین اقسام کو عینِ دین بنا لیا گیا ہے۔ قرآن یہ کہنے آیا تھا کہ اور تو اور‘ کسی رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود بھی احکام خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ لیکن وہی اسلام‘ پیر پرستی میں ایسا ممسوخ ہو گیا کہ پیر کے کسی حکم کے لئے نہ قرآن کی ضرورت ہے نہ عقل و بصیرت کی نہ دلیل کی حاجت۔ ملوکیت کا استبداد انسان کے جسم تک ہی محدود ہوتا ہے۔ لیکن پیر پرستی کے استبداد کو دیکھئے کہ یہ دل و دماغ پر مستولی‘ رگ و ریشہ میں اترا ہوا اور قلب و روح پر چھایا ہوا ہے۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف دل میں بھی کوئی خیال گزرتا ہے تو یہ ڈرتا ہے‘ لرزتا ہے‘ کانپتا ہے۔ انسان ملوکیت کی غلامی سے ہر وقت بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ اگر پیر کسی کو اپنے آستانے سے دور ہو جانے کا حکم دیتا ہے تو روتا ہے‘ گڑگڑاتا ہے‘ دنیا بھر کی سفارشیں لاتا ہے‘ سجدے کرتا ہے‘ ناک رگڑتا ہے کہ حضور! مجھے راندۂ درگاہ نہ بنائیے‘ میں دنیا اور آخرت میں کہیں کا نہیں رہوں گا! میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے دنیا میں‘ اپنے خدا کے سوا‘ کسی اور کا ڈر نہ ہو‘ قرآن نے خوف کا نشیمن مشرک کا قلب بتایا تھا۔ لیکن اسی قرآن کے ماننے والوں کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ خود اپنے جیسے انسانوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ ان الذین تدعون من دون اللہ عبادا امثالکم (۷/۱۹۴) ’’جنہیں تم خدا سے ورے ہی پکارتے ہو وہ تو خود تمہارے جیسے انسان ہیں‘‘۔ لیکن یہ انہیں اپنے جیسے انسان نہیں بلکہ خدا مانتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ نہیں یہ غلط ہے۔ پیر کو خدا نہیں مانا جاتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ لفظاً اگر اسے خدا نہیں کہا جاتا تو کیا معناً اسے خدا نہیں مانا جاتا۔ خدا نے کہا تھا کہ دنیا میں کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت حاصل نہیں۔ پیر کے متعلق یہ ایمان ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان کی ساری طاقتیں اس کے قبضہ میں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ انسانی تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ پیر پرستی کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے۔ اگر یہ عقیدہ نکال دیا جائے کہ پیر کو نفع و نقصان کی قدرت حاصل ہے تو پیر

پرستی آج ختم ہو جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہم پیر کی اطاعت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا تک پہنچا دے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب مشرکین سے پوچھئے کہ تم اپنے پیروں کی پرستش کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم انہیں خدا نہیں مانتے بلکہ انہیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

والذین اتخذوا من دونه اولیاء ما نعبد هم الا لیقربونا الی الله ذلفیٰ (۳۹/۳)۔

جو لوگ اللہ سے ورے ہی لوگوں کو اپنا کارساز بنا لیتے ہیں (جب ان سے پوچھئے تو وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو معرفت الٰہی کا وسیلہ بناتے ہیں اور اس کے لئے یہ آیت بطور سند پیش کرتے ہیں۔

یایها الذین امنو اتقو الله وابتغوا الیه الوسیله (۵/۳۵)۔

اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔

حالانکہ یہی آیت ان کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔ اوپر کا حصہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے۔ باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ

وجاهدوا فی سبیله لعلکم تفلحون۔

یعنی اس کے راستہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

یعنی تقرب الٰہی کا حقیقی وسیلہ جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ ہے کہ راہ حق میں، باطل کے خلاف جہاد کیا جائے نہ یہ کہ کسی انسان کا دامن تھام کر بیٹھ جائے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے انسانی توسل خالص شرک ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ (خدا کیا ہے! انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے۔ قرب الٰہی کسے کہتے ہیں۔ اس سے انسان کے شعور میں کیا انقلاب آتا ہے۔ یہ تمام مباحث الگ ہیں۔ ان پر اس وقت بحث نہیں ہو سکتی۔ قرآن، اللہ اور بندے کے درمیان کسی حاجب اور دربان کو جائز قرار نہیں دیتا۔ خدا ہر بندۂ مومن سے کہتا ہے کہ ادعونی استجب لکم۔ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ امن یجیب المضطر اذا دعاه ''وہ کون ہے جو کسی بے قرار کی پکار کا جواب دیتا ہے؟'' اله مع الله۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے جو ایسا کر سکتا ہے؟

اذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دهان

اور جب میرے بندے میری بابت تجھ سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ ہر پکار سننے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔

باقی رہا یہ کہ ہم رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے مرشد و ہادی کی تلاش کرتے ہیں سو یاد رکھئے کہ یہ آیت قرآن میں آ چکی۔ ظاہر، باطن، شریعت، طریقت سب کچھ وہی ہے۔ خدا سے ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا ہی نے صراط مستقیم کہا اور جسے خود نبی اکرمؐ نے امت کو دکھا دیا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف خدا کی غلامی اختیار کر لی جائے۔ یہی خود رسول اللہ ﷺ نے کیا اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

ان الله ربی و ربکم فاعبدوه۔ هذا صراط مستقیم (۳/۵۱)۔

میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے، اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ

ہے صراط مستقیم۔

اس کے علاوہ اور کوئی ''راز'' نہیں جو حضورؐ خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتا گئے ہوں کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جس کے لئے حضورؐ مامور تھے۔ حضورؐ کو ارشاد تھا کہ بلغ ما انزل الیک یعنی جو کچھ تم پر نازل کیا جاتا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ چنانچہ حضورؐ نے یہ سب کچھ لوگوں تک پہنچا دیا اور آپ نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں اس کا اقرار بھی لے لیا کہ آپ ﷺ نے سب کچھ پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ حضورؐ نے ''مغز دین'' عوام تک نہیں پہنچایا تھا بلکہ وہ چپکے چپکے خواص کو بتایا تھا جو پھر اسی طرح آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے' خود ہی فیصلہ فرمالیجئے' کہ (نعوذ باللہ) ذاتِ رسالت مآبؐ کے متعلق کیا خیال پیدا کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آتی اور یہ عقیدہ رکھے جا رہے ہیں کہ دین کا ایک حصہ (جو درحقیقت اصل دین ہے) حضورؐ نے لوگوں سے چھپا کر چپکے سے کسی کے کان میں کہہ دیا تھا اور وہ کانوں کان آگے چلا آ رہا ہے۔ باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو بلاشبہ تمام وہ اسلاف جنہوں نے دنیا میں قوانین الٰہیہ کو قوت نافذہ بنا کر چلایا' اس قابل ہیں کہ ان کے کارناموں کی یاد قائم رکھی جائے۔ ان کی مبارک زندگیاں ہمارے لئے تقویتِ ایمان کا موجب ہیں' اس لئے کہ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ باطل کی تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف مسلسل جہاد سے کس طرح حق کا غلبہ قائم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں قرآن کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں تک پہنچائی' اور دنیا میں خدائی حکومت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اعمال صالحہ دنیا میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں کہ حوادثِ زمانہ کی نامساعد موجیں آئیں اور ان سے ٹکرا کر لوٹ جائیں۔ وکذالک نجزی المحسنین۔

لیکن تعظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔

مُردہ پرستی: پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا' بلکہ اس کی مملکت ابدی ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے جیسا کہ زندگی میں بلکہ اب اس کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربار خداوندی کا حاضر باش ممبر تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدہ ''وصال بالحق'' کی رو سے تو وہ خدا میں مل کر خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے' ہر ایک کی دعائیں سنتا ہے' ان کی مشکل کشائی کرتا ہے' مصیبت میں بعض اوقات بنفس نفیس تشریف لا کر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہئے تھا اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ کسی دنیا والے کی سننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

ان تدعوا هم لا يسمعوا دعاء كم ولو سمعوا ما استجابوا لكم ويوم القيامة يكفرون بشرككم (۳۵/۱۴)۔

اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر بفرض محال سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔ ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لئے اٹھائے جائیں گے۔

''اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود مخلوق ہیں مردہ ہیں' زندہ نہیں ہیں' اور اتنی بھی

خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے (۲۰۔۲۱/۱۶)

ماضی پرستی: ہم نے جس قدر پرستشیں گنائی ہیں' اگر آپ بنظر تعمق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدر مشترک نظر آئے گی' اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہ ہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے۔ اسلام مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنانے والا دین تھا لیکن انسانی دماغوں نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو بہرکیف انسانی مذہب ہی ہوسکتا تھا جس کی رو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج' بڑا تاریک ہے اور گزشتہ کل بڑا روشن تھا۔ یہ کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج سے پیچھے ہٹتے جائیے اور ہر ایسی بزرگ کی تصنیف اٹھائیے جس کا عہد آپ کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی یہی گلہ کرتے ہوں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے اور گزشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ ذہن انسانی کی کچھ افتاد ہی ایسی ہے' اور اسی افتاد کا نتیجہ ہے' کہ جو شئے گزشتہ زمانہ سے متعلق ہو واجب التعظیم ہو جاتی ہے۔ ائمہ پرستی' اسلاف پرستی' مردہ پرستی' سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں اور جب تک ماضی پرستی کا تخیل درست نہ ہوگا' حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی پرستی سے بے نیاز ہو جائیں۔ ماضی ہمارے آباء واجداد کی وراثت ہے ہم اس سے متمتع کیوں نہ ہوں۔ لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہد ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ایسا مکمل ہو گیا کہ اس میں کوئی نقص' کوئی کمی باقی نہیں رہی نہ اس پر اضافہ ہوسکتا ہے' نہ ترمیم نہ اس پر تنقید ہوسکتی ہے' نہ تنقیح' یہ ہے ماضی پرستی۔ دین یقیناً مکمل ہو چکا۔ اس اعتبار سے عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابۂ کبارؓ نوع انسانی کی تاریخ میں اسلام کے صحیح مظہر کا دور ہے کہ جس دور میں قرآن کے احکام زندگی کا عملی دستور بنے تھے۔ لیکن قرآن تو کتاب فطرت ہے۔ جس طرح فطرت کے راز ہائے سربستہ ذہن انسانی کے نشوارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور فطرت کی کوئی شے کسی مقام پر بھی جا کر یہ نہیں کہہ دیتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے' میرے سینے میں جس قدر گہر ہائے آبدار موجود تھے وہ سب باہر آ چکے ہیں' اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقل انسانی کے ساتھ ساتھ جلوہ بار ہوتے جائیں گے' اور چونکہ یہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے آخری کتاب ہے اس لئے جب تک دنیا میں انسان باقی ہیں' یہ ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامانِ ہدایت دیتی چلی جائے گی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہوسکتا۔ لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر برف کی سلیں رکھی جاتی ہیں' عقلیں معطل ہو جاتی ہیں' قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں' فکر و نظر کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ کبھی قدم اٹھتے بھی ہیں تو منہ کا رخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے اس لئے ہر قدم منزل سے اور بعید ہو جاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں اور یہ قوموں کے امام پیچھے جاتے ہیں۔ دنیا اوپر کو ابھرتی ہی اور یہ دنیا کے پیشوا نیچے کو جاتے ہیں۔ انکے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ انہیں اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتیں۔ جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا (اور یہ ماضی پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔) وہ قومیں کبھی ابھر نہیں سکیں۔ انہوں نے کبھی ابھرنا بھی چاہا تو چونکہ ان کا اصل دین ان سے گم ہو چکا تھا اسی لئے انہیں سہارا دینے کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ ان کے خدا کی کتاب زندہ ہے اور یہ قوم پھر مردہ کی مردہ۔ سچ ہے زمین شور پر ابر رحمت کیا گہر باری کرے گا۔ وتلک الامثال نظر بها للناس لعلهم يتفكرون۔

حقائق پرستی: آپ نے غور فرمایا کہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر

کیا گیا ہے اس لئے پیدا ہوگئیں کہ مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی چھوڑ کر شخصیت پرستی اختیار کر لی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائق ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن وتخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ علوم وفنون کی نشر واشاعت زیادہ تر عہد عباسیہ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مرکز اسلام پر یکسر عجمیت غالب آ چکی تھی اور مشاہیر پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی، اس لئے اگر ایک طرف بادشاہ ظل اللہ قرار دیا گیا تو دوسری طرف ائمہ مذہب کی پرستش بھی کسی کم درجہ میں نہیں کرائی گئی حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وہ چیزیں ہوسکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلّف ہیں نہ کہ ہر انسان۔ اللہ اور اس کا رسول اور اس کی کتاب بلا شک وشبہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ لیکن کسی اور انسان پر ایمان لانا تو کہیں نہیں لکھا، اس لئے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جائے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی غلط عقیدت وارادت ہمارے دلوں میں بزرگان سلف سے پیدا ہو چکی ہے اور جو صدیوں سے متوارث چلی آتی ہے اس کو صحیح اور جائز عقیدت اور ارادت سے بدل دینا آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جو طوق وسلاسل مسلمانوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں اور جس کے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا فطرتِ ثانیہ بن چکے ہیں، انکا اتار پھینکنا محال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی چیز کو ایک عرصہ تک پنجرہ میں بند رکھا جائے تو وہ پھر اس قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس کا مالک اسے پنجرہ کے باہر کھلا چھوڑ دیتا ہے، خود پنجرہ لے کر آگے آگے چلتا ہے اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور چونچیں مار مار کر اس کا دروازہ کھولتا ہے۔ حالانکہ اس کے بازوؤں میں قوت بھی ہوتی ہے اور آزادی کی فضائے بسیط اس کی آنکھوں کے سامنے۔ لیکن اس کے نزدیک جو آرام قفس کے گوشہ میں ہوتا ہے کھلی فضا میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کھلی فضا کو غیر فطری چیز سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدتہائے دراز کی ذہنی غلامی سے ہم اس درجہ خوگرِ بند وسلاسل ہو چکے ہیں کہ ان کے اتارنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک متاعِ گراں بہا چھنی جا رہی ہے، دین ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ عاقبت خراب ہو رہی ہے لیکن یہ سب ہمارے قلوب کے وساوس ہیں، ذہن کے چھلاوے ہیں۔ جس چیز کو ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں۔ جو ہمیں ہدایت نظر آتی ہے وہ ہدایت نہیں، دھوکہ ہے۔ فریب ہے اور یہ اس لئے کہ

ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فهوله قرین وانهم لیصدونهم عن السبیل ویحسبون انهم مهتدون (۴۳/۳۷۔۳۶)۔

جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے اندھا بن جاتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ (شیاطین) ان کو راہ سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ روکتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیدھے راستے پر ہیں۔

آخر میں ''حضرات علماء کرام'' کی خدمت میں باادب گزارش کروں گا کہ وہ تصریحات بالا پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ یہ حضرات عملی دنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں اس لئے انہیں معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ الحاد و

بے دینی کی اس رو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ دین کی اتنی ہی خدمت اور ان برائیوں کا صرف اسی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاویٰ میں ان لوگوں کو مردود و ملعون قرار دے دیا جائے۔ لیکن اس سے اصلاح تو نہیں ہو سکتی۔ اس سے تو مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے خلا ملا کا بہت موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری زندگی ہی ان میں گزری ہے۔ اس لئے میں نے ان کی ذہنی افتاد اور رجحانات قلبی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرت صحیحہ نے مذہبیات کے اس حصہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے' لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اسے بھی دینِ خداوندی سمجھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حصہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا جو اسی طرح ہمارے حامیانِ دین کے بگاڑے ہوئے مریض تھے۔ میں نے ان ''علما گزیدہ'' نوجوانوں کے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا جو فی الحقیقت دین ہے' تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے آج اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیشتر مساعی خود دین کی مدافعت میں صرف کر رہے ہیں میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ جدت پسند طبقہ کی طرح قرآن کریم کی دوراز کار تاویلات کی ہوں اور ان کے ذہنی و قلبی رجحانات کی رعایت سے حقیقت کو ان سے چھپایا ہو۔ میں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول اللہ ﷺ سے جو خود قرآن کے اندر موجود ہے ان کے سامنے رکھ دی اور اس کے بعد بتا دیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانہ جدید سے متعلق ہو یا قدیم سے' اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کبھی حقیقت ثابتہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت صرف یہی ہے اور یہی دین ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ایک ایسے ماحول کا تجربہ ہے۔ جسے یکسر ''یورپ زدہ'' ماحول کہنا چاہئے۔ اور جس کے ہاتھوں مولوی صاحبان اس درجہ نالاں ہیں اور یہی تجربہ ہے جو ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی۔ میں اپنے فہم قرآن کو کبھی سہو و خطا سے مبرا نہیں سمجھتا۔ میں اپنی ہر غلطی کی اصلاح کے لئے ہر وقت تیار ہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے۔

ان الھدیٰ ھدی اللہ و فیھا بصائر للناس
وھدی و رحمۃ لقوم یوقنون۔

(مطبوعہ اکتوبر 1949ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک دلچسپ بحث

(بلا تبصرہ)

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(عطاء الحق قاسمی)

ہمارے ذہنوں میں مولوی کا تصور وہی ہے جو آدھی رات کو مسجد کے چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے یا سیاسی مولویوں کی دوعملی ہمارے ذہنوں میں مولوی کا امیج مسخ کرنے کا باعث بنی ہے لیکن میں ''مولویوں'' میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ان کے مثبت اور منفی پہلو دونوں میرے ذہن میں ہیں۔وہ جو صحیح معنوں میں مولوی ہیں' ان کا وژن بہت وسیع ہے۔مسٹر حضرات ان کی جہتوں سے واقف ہی نہیں ہیں۔ان کا طرز استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے مسٹر حضرات مولوی پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کرتے ہیں' وہاں وہ بہت عرصے سے مولوی کو مسلم امہ کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں اور ہم لوگ ان کی بات پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں۔

مجھے گزشتہ روز ڈاک میں مولانا زاہد الراشدی کی شائع شدہ ایک تحریر ملی جو انہوں نے مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کی تھی۔اس میں مولانا نے دیگر الزامات کے علاوہ اس الزام کا جواب بھی دیا ہے جو مولوی حضرات پر مسلمانوں کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مجھے مولانا کی بات میں وزن محسوس ہوا ہے اور یوں صورتحال

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

والی لگتی ہے۔مولانا کی تقریر سے ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے:

''سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا میں اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب و آلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔صرف ایک مثال سے بات سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی دولت سے نوازا۔خلیج میں تیل کی دولت دی۔ یہ ہمارا ادبار کا دور تھا' زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطا فرمائی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے' چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے' تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لئے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔مغربی ماہرین

آئے' پھر مغربی کمپنیاں آئیں' ان کے بعد بینک آئے' پھر سیاست کار آئے اوران کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آ گئیں جوآج تیل کے چشموں کا گھیراڈالے بیٹھی ہیں۔

ذراخیال کیجئے کہ تیل ہمارا' چشمے ہمارے' کنویں ہمارے' زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے' صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اورآج ماہرین' کمپنیاں' بینک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے' صاف کرنے اور مارکیٹنگ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ ابھی امریکی وزارت دفاع پینٹا گان میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی احکامات کی من وعن تابع داری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے اور مغربی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کر لئے جائیں گے۔

اس لئے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنا چاہئے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے' دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟

میں تاریخ کے حوالے سے بات کروں گا۔ جب 1857ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا' دینی مدارس ختم کر دیئے تھے' نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علماء کرام نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے عوام سے تعاون کے لئے رجوع کیا' چندے مانگے' گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں' زکوٰۃ وصدقہ کے لئے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے آثار کو بچانے کے لئے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی' سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگیں' ہاں ہاں میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں' اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے اپنی طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پروا نہیں کی' طعنے سنے ہیں' بے عزتی برداشت کی ہے لیکن قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن بھی دے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی' سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا' انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمے لی۔ انہیں اس کام کے لئے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قومی خزانے کے کھربوں

روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے' ریاستی پشت پناہی حاصل تھی لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری مولوی کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے' قرآن و سنت کی راہنمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالئے۔ یہ ناانصافی ہے' اس کے بارے میں ان سے پوچھئے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لئے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لئے امام میسر ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لئے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لئے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لئے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی راہنمائی دینے کے لئے علماء کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟ اس سے اگلی بات کہ میدان جنگ میں کفر کے خلاف صف آراء ہونے والے مجاہدین بھی ان مدارس سے آپ کو مل رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی آج ہی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ انہوں وفاقی وزراء سے کہا کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجئے اور ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجئے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

(روزنامہ جنگ' 27 دسمبر 2002ء)

☆☆☆

مولانا زاہد الرشدی کے جواب میں!

(عطاء الحق قاسمی)

کسی بھی لکھاری کے لئے اس کے قارئین کے خطوط بہت اہم ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ کالم میں شائع بھی ہوں لیکن ان سے مسئلے کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ گزشتہ دنوں میرا ایک کالم ''ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا'' کے عنوان سے شائع ہوا جو دینی مدرسوں اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے مولانا زاہد الرشدی کی ایک تقریر کے حوالے سے تھا۔ مجھے مولانا کی بات میں بہت وزن محسوس ہوا تھا چنانچہ میں نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ مجھے اس کالم پر پاکستان کے مختلف شہروں سے تائیدی ٹیلیفون موصول ہوئے تاہم ٹورنٹو (کینیڈا) سے ایک قاری انصر رضا نے مجھے اپنا موقف بذریعہ فیکس (042-7513234) ارسال کیا جو مولانا زاہد الرشدی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ چونکہ انصر رضا صاحب نے بھی اپنی بات سلیقے سے اور دلیل سے کی ہے' سو ان کا موقف اور اس حوالے سے میری معروضات درج ذیل ہیں:

جناب عطاء الحق قاسمی صاحب

السلام علیکم

جناب زاہد الراشدی صاحب کے جس اقتباس میں آپ کو وزن محسوس ہو رہا ہے اور جس سے آپ بظاہر متاثر ہیں، وہ خود فریبی اور تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بلکہ یکسر چھپا کر اپنی پاکی داماں کی حکایت کو بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں ایک غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے دینی مدارس ختم کر دیے تھے۔ میں انگریزوں کا حامی نہیں ہوں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدرسہ دیوبند اور دارالعلوم ندوہ انگریزوں کے دور میں ان کی سرپرستی میں بنے۔ دارالعلوم ندوہ کا سنگ بنیاد یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر نے رکھا تھا لہٰذا انگریزوں پر یہ الزام کہ انہوں نے دینی مدارس ختم کر دیئے تھے، نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی، بالکل غلط ہے۔ کلکتہ اور دہلی کے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی علوم پر ریسرچ اور علماء کو 'شمس العلماء' کے خطابات سے ان کی عزت و توقیر بڑھانا اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں نے نظام تعلیم کو ترقی دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم اسلام میں کہاں جائز ہے کہ علماء اس پر راضی ہو گئے کہ ہم صرف دینی علوم پڑھیں گے اور باقی لوگ دنیاوی علوم حاصل کریں؟ ماضی کے مشہور مسلمان مفکرین اور سائنس دان دونوں علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اقتدار کا مسئلہ ہو تو سیاست دین سے الگ نہیں ہو سکتی لیکن علم سیکھنے کی بات ہو تو مشکل علوم کا بوجھ عامتہ الناس کے کندھے پر ڈال کر خود حلووں پر راضی ہو جائیں۔

جس دوسرے طبقے نے یہ نام نہاد ذمہ داری قبول کی تھی، ان کی راہ میں ان علماء نے کتنے روڑے اٹکائے اور کفر کے فتوؤں سے کیسی کیسی گولہ باری کی، کون نہیں جانتا؟ مشہور ترین مثال سرسید احمد خان کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کی ٹھانی اور بدترین ظلم کا نشانہ بنے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ علمائے دین کا بنیادی کام نیکی کی دعوت اور برائی سے بچنے کی تلقین کرنا ہے۔ انہیں نوید اور وعید دونوں سنانا ہیں لیکن ہوا یہ کہ وہ لوگوں پر صرف آگ برسانے لگے۔ اگر آپ ان کے عقائد اور قرآن و سنت کی من مانی تشریح سے متفق ہیں تو آپ پکے مومن ہیں، چاہے آپ رشوت خور ہوں، ذخیرہ اندوز ہوں، مزارعوں اور ماتحتوں پر ظلم کرنے والے ہوں، دھاندلی اور دھونس سے الیکشن جیتنے والے ہوں۔ لیکن اگر آپ ان کے مفہوم دین سے متفق نہیں تو آپ قطعی طور پر زندیق اور فاسق ہیں، چاہے آپ پنج وقتہ نمازی ہوں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حتی الوسع خیال رکھتے ہوں۔ قول و فعل کے اس تضاد اور اقتدار کی ہوس نے عوام کو ان علما سے متنفر کر دیا اور یوں ایسی مسلمان امت وجود میں آئی جسے خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ وہ دین کی رہی اور نہ دنیا کی۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری علمائے دین پر ہے جنہوں نے ایک طرف تو عوام کی اصلاح و تربیت سے منہ موڑ لیا اور قرآنی معارف سے نہ خود آگاہ ہوئے نہ دوسروں کو اس کا شوق دلایا اور دوسری طرف دنیاوی علوم کو بیکار کہہ کر حوصلہ شکنی کی۔

(والسلام۔ انصر رضا، ٹورنٹو، کینیڈا)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایک انگریز گورنر نے دارلعلوم ندوہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا لہٰذا ثابت ہوا کہ انگریز دینی تعلیم کے پروموٹر تھے تو یہ بات حقائق سے لگا نہیں کھاتی۔ آج اگر صدر بش واشنگٹن کے اسلامی مرکز میں جوتے اتار کر اندر داخل ہوتے ہیں اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سادہ لوحی ہوگی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ اسی طرح انصر رضا صاحب نے مشرقی علوم کے اداروں کی سرپرستی کے حوالے سے جو نتائج اخذ کئے ہیں' وہ بھی محل نظر ہیں۔ سمجھدار محکوم قوم کی نفسیات سے مکمل آگاہی اور یوں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے ایسے ادارے قائم کیا ہی کرتے ہیں۔ یہ ادارے مقامی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے کے لئے بھی قائم کئے جاتے ہیں چنانچہ امریکہ میں بھی ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ سرپرستی میں اس نوع کے ادارے قائم ہیں اور اس نوع کے ایک ادارے کے نصاب میں راقم الحروف کی تصنیفات بھی شامل ہیں۔ نیز جن علماء کو شمس العلماء وغیرہ کے خطابات دیئے گئے' وہ دینی تعلیم کے حوالے سے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک 'شمس العلماء' (مولانا محمد حسین آزاد) ایک اسلامی ملک میں باقاعدہ انگریزوں کے جاسوس تھے۔

البتہ دینی تعلیم اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے انصر رضا صاحب نے جو دوسرے نکات اٹھائے ہیں' وہ واقعی قابلِ توجہ ہیں' ان کا جواب مولانا زاہد الراشدی پر واجب ہے۔ یہ جواب اگر اتنا ہی مختصر ہوا جتنا انصر رضا صاحب کا خط ہے تو ان شاء اللہ انہی کالموں میں شائع ہوگا!

(روزنامہ جنگ' 6 جنوری 2003ء)

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

(عطاء الحق قاسمی)

میرے ایک کالم میں دینی مدارس کے حوالے سے مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب کا نقطہ نظر شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ایک قاری انصر رضا صاحب کا ایک تنقیدی خط بھی کالم میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد اس موضوع کی حمایت اور مخالفت میں بے شمار خطوط موصول ہوئے اور ظاہر ہے ان سب کی اشاعت ممکن نہ تھی چنانچہ میں نے یہ سلسلہ وہیں روک دیا۔ قاری کے تنقیدی خط کا جواب مولانا زاہد الرشدای نے دفتر کے پتہ پر ارسال کیا جو مجھے نہ مل سکا۔ اب انہوں نے دوبارہ یہ زحمت کی ہے جس کی وجہ سے یہ خط تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ دینی تعلیم دینے والے اور دنیاوی تعلیم دینے والے دونوں طبقے صرف ''ضروری صورت'' کے عالم اور دانشور پیدا کر سکے ہیں۔ دینی مدرسوں سے کوئی رازیؒ اور کوئی غزالیؒ ابھر کر سامنے نہیں آیا اور دنیاوی مدرسے ہمیں کوئی آئن سٹائن' کوئی نیوٹن نہیں دے سکے۔ دونوں نے بس ''غریبی دعوے'' والا کام کیا ہے۔ باقی رہی تنگ نظری کی بات' تو اپنے رویوں کے حوالے سے ''ملا'' دونوں طرف موجود ہیں۔ ایک طرف دین کے نام پر شٹل کاک برقعے کو لازمی قرار دینے والے بھی ہمارے درمیان ہیں اور دوسری طرف سیکولرازم اور روشن خیالی کے نام پر ترکی میں خواتین کے سکارف اوڑھنے پر بھی پابندی۔ یعنی ''ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا'' والی صورتحال ہے۔ بہرحال مولانا راشدی کا خط ملاحظہ فرمائیں:

''برادر محترم عطاء الحق قاسمی صاحب

آپ کے کالم میں محترم انصر رضا آف ٹورنٹو کا خط پڑھا۔ آپ کا

شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمارا نقطہ نظر جنگ کے ذریعہ ایک وسیع دائرے تک پہنچایا اور انصر رضا صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر بہت سے قارئین کو میری معروضات دوبارہ پڑھنے اور مجھے کچھ مزید باتوں کی وضاحت کا موقع فراہم کیا۔

انگریزوں کی طرف سے دینی مدارس کی سرپرستی کے حوالہ سے آپ کا موقف درست ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جارج ڈبلیو بش صرف جوتے اتار کر مساجد میں نہیں جا رہے بلکہ اخباری رپورٹوں کے مطابق امریکی حکومت نے پاکستان کے دینی مدارس کی ترقی، تعمیر اور اصلاح کے لئے ایک خطیر رقم بھی مختص کر رکھی ہے اور اس رقم کا مصرف مہیا کرنے کے لئے ہوم ورک جاری ہے۔ اسے اگر انصر رضا صاحب دینی تعلیم کی سرپرستی سمجھتے ہیں تو انہیں مبارک ہو۔ ہم دینی مدارس والے اس مہربانی کے متحمل نہیں ہیں۔

جہاں تک دیوبند کے مدرسہ کی انگریزوں کی طرف سے سرپرستی کا سوال ہے، ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں دیوبند کے مدرسے اور مکتب فکر کا تاریخی استعمار دشمن کردار اس کی وضاحت کے لئے کافی ہے اور کسی منصف مزاج شخص کے لئے اس سے زیادہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ انصر رضا صاحب کی خدمت میں یہ سوال ضرور پیش کرنا چاہوں گا کہ اگر ان کے بقول انگریزوں نے دینی مدارس کو ختم کرنے اور ان کے نظام کو تلپٹ کر دینے کے بجائے ان کی سرپرستی کی تھی تو 1857ء سے پہلے جو تعلیمی نظام اور نصاب پورے برصغیر میں رائج تھا، اسے ختم کر کے اس کی جگہ نئے تعلیمی نظام کو کس نے نافذ کیا تھا؟ اگر انصر رضا صاحب نظام تعلیم کی اس تبدیلی کے محرکات اور اہم مراحل سے آگاہ کر سکیں تو ان کا ہم پر بہت کرم ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی مدارس نے صرف دینی تعلیم پر اکتفا کیوں کیا اور دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تقسیم کیوں کی تھی، اس کے بارے میں عرض ہے کہ دینی علوم کے وارثین نے کبھی دین و دنیا کی تقسیم نہیں کی اور نہ ہی وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ ہاں اس دور کے معروضی حالات میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے غریبی دعوے کے ساتھ اتنا کام ہی کر سکتے ہیں اور وہ انہوں نے بحمد اللہ پورا کر دکھایا۔ یہ تقسیم علوم کا نہیں بلکہ تقسیم کار کا مسئلہ ہے اور اگر غصہ تھوک کر میری گزشتہ کالم کی معروضات پر سنجیدگی سے ایک نظر پھر ڈال لیں تو مجھے یقین ہے کہ خود انصر رضا صاحب محترم کے ذہن میں بھی یہ اشکال باقی نہیں رہے گا۔

انصر رضا صاحب نے سرسید احمد خان مرحوم کے کام میں رکاوٹ ڈالنے اور ان کی دینی تعبیرات کی مخالفت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری استدعا ہے کہ سرسید احمد خان مرحوم نے قرآن و سنت کی جس نئی تعبیر و تشریح کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کی صرف علماء نے مخالفت نہیں کی بلکہ انہیں خود سرسید مرحوم کے رفقاء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم، شبلی نعمانی مرحوم اور ان کے دیگر معاصرین مثلاً اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور ان تعبیرات و تشریحات سے کھلے بندوں براءت کا اظہار ضروری سمجھا تھا اور اس سے بڑھ کر سرسید احمد خان مرحوم کے شاگردوں میں سے بھی کسی نے دین کی اس تعبیر و تشریح کو اختیار نہیں کیا تھا۔ اگر سرسید احمد خان مرحوم کے کسی ساتھی یا شاگرد کا نام انصر رضا صاحب کو معلوم ہو کہ اس نے سرسید احمد خان کی

دینی تعبیرات کو اختیار کیا تھا اور انہیں آگے بڑھانے میں دلچسپی لی تھی تو وہ اس کی نشاندہی فرما دیں۔ میں اس پر ان کا بے حد شکرگزار ہوں گا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سرسید کی مخالفت کے الزام کا نزلہ عضوضعیف مولوی پر ہی کیوں گرتا ہے اور ان تعبیرات کو رد کر دینے والے دیگر حضرات انصر رضا صاحب جیسے دوستوں کو کیوں یاد نہیں رہتے؟ اس سلسلے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ علمائے کرام نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ یہ بات بھی قطعی بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا دور 1857ء سے بہت پہلے کا ہے اور ان کے فتاویٰ عزیزی میں آج بھی یہ فتویٰ موجود ہے جس میں انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا تھا جبکہ مولانا رشید احمد گنگوہی سرسید احمد خان مرحوم کے معاصرین میں سے ہیں بلکہ یہ دونوں بزرگ ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد ہیں اور مولانا گنگوہی کے فتاویٰ رشیدیہ میں بھی فتویٰ موجود ہے کہ انگریزی زبان کو بطور زبان سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں اور یہ جائز ہے۔

انصر رضا صاحب اگر اس دور کے حالات کا مطالعہ رکھتے ہیں تو یہ بات بھی یقیناً ان کے علم میں ہوگی کہ سرسید احمد خان مرحوم نے جب علی گڑھ میں کالج قائم کیا تو اس کے شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ مولانا عبداللہ انصاری تھے جو بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے اور انہیں خصوصی فرمائش پر علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔ انہی مولانا عبداللہ انصاری کے فرزند مولانا محمد میاں انصاری ہیں جنہوں نے راجہ مہندر پرتاب، پروفیسر برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ مل کر آزادی ہند کے لئے جاپان، جرمنی اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ رابطے کر کے آزاد ہند گورنمنٹ کی بنیاد رکھی تھی اور جلاوطنی کی حالت میں کابل میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

ان حالات میں بھی اگر انصر رضا صاحب کو یہی نظر آتا ہے کہ علماء نے سرسید احمد مرحوم کے کام میں روڑے اٹکائے تھے، انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی، خود انگریز کی سرپرستی میں مدرسے چلائے تھے اور وہی ساری قوم کی سب خرابیوں کے ذمہ دار ہیں تو ہم فقیر لوگ ان کے لئے دعائے صحت ہی کر سکتے ہیں۔

میں ایک بار پھر آپ کا شکرگزار ہوں لیکن کالم کی تنگ دامنی کے شکوہ کے ساتھ کہ بہت سی اور ضروری باتیں بھی اس خط میں شامل کرنا چاہتا تھا مگر.....''

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا مکتوب گرامی

محترم ومکرمی مولانا زاہدالراشدی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، مزاج گرامی

آپ سے تعارف خاصا پرانا ہے۔ آپ کی تحریر اور تقریر کی صلاحیت کا معترف بھی ہوں اور مداح بھی۔ ندائے خلافت کے تازہ شمارہ نمبر 1 مورخہ 8 جنوری 2003ء میں آپ کے مضمون ''قصوروار کون؟'' نے اتنا متاثر کیا کہ آپ سے تحریری رابطہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ حالانکہ میں تحریر کا کافی ''چور'' واقع ہوا ہوں۔ ٹیلی فون پر یا بالمشافہ ملاقات مجھے آسان محسوس ہوتی، بہ نسبت تحریر کے۔

مولانا! آپ نے آج کے جدید علوم کے علمبردار طبقہ کو بہت ہی مدلل اور مؤثر جواب دیا ہے اور باوجود اس کے کہ میں نہ عالم

دین ہوں اور نہ کسی روایتی مدرسے سے تعلیم یافتہ بلکہ علم کے نام پر زیادہ تر ان ''نام نہاد جدید تعلیمی اداروں'' ہی سے استفادہ کیا ہے جن پر آپ نے تنقید کی ہے' اس کے باوجود مجھے آپ کی تحریر پسند آئی ہے۔

لیکن مولانا! آپ سے کچھ ''آپس کی بات'' کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی یہ تحریر جدید علوم کے علمبردار طبقے پر ''ایک الزامی جواب'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے بقول علامہ اقبالؒ۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہہ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون؟

یہ بات درست ہے کہ جدید علوم کے نام پر اتنے وسائل خرچ کرنے (جن میں سب سے زیادہ حکومتی وسائل ہی خرچ ہوتے ہیں) کے باوجود ہم ٹیکنالوجی کے میدان میں اتنے پیچھے کیوں ہیں؟ اور آپ نے اس پر جدید علوم کے علمبرداروں اور مسلمان حکومتوں اور مسلمان حکمرانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس کے مقابلے میں دینی علوم کے علمبرداروں نے باوجود وسائل کی کمی اور نامساعد حالات کے قرآن وحدیث کے علم کا سلسلہ جاری رکھا اور آج نہ کسی خطیب کی کمی ہے اور نہ حافظ قرآن کی۔

مولانا! آپ نے جدید ٹیکنالوجی میں مہارت کے مقابلے میں عام دینی تعلیم کا حوالہ دے دیا۔ جدید تعلیم میں مہارت کے مقابلے میں تو دینی علوم میں مہارت کی مثال پیش کی جانی چاہئے تھی۔ جہاں تک عام مروجہ تعلیم کا تعلق ہے' اس کے ذریعے مروجہ حکومتی نظام چلانے والے کارندوں کی ضرورت ہے جو بحسن وخوبی پوری ہو رہی ہے۔ جہاں تک عام ٹیکنیکل علم ومہارت کا تعلق ہے' اسمیں تو ہمیں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہاں تک جدید ٹیکنالوجی اور اس میں تحقیق اور ایجادات اور اس میں مہارت کا تعلق ہے' قریباً تمام ہی مسلمان ممالک اس میں ''پھسڈی'' ہیں۔ صرف ایک استثناء ہے کہ پاکستان نے کم از کم ایٹمی ٹیکنالوجی میں تو وہ ترقی کی ہے جس کا اعتراف ہمارا دشمن اور مغرب بھی کرنے پر مجبور ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ مہارت بھی ہمیں اللہ تعالیٰ نے خالصتاً معجزانہ انداز میں عطا فرما دی ہے' بغیر کسی باقاعدہ منصوبہ بندی اور علم وتحقیق میں عمومی ترقی کے۔ اب آیئے دینی علم کی طرف۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام دینی علوم کی ترویج کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن جدید ٹیکنالوجی میں مہارت کے مقابلے میں دینی حلقوں نے کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق دین کو کس نے اور کہاں پیش کیا ہے؟

بعض خود ساختہ شرائط کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ ہم نے بند کر رکھا ہے۔ طبقہ علماء میں کوئی ایسی قیادت ابھر کر آئی ہے جس نے واقعتاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ہو؟ پوری امت مسلمہ ''ایک امام'' سے محروم ہے۔ بلکہ برا نہ مانئے' اس عام دینی علم نے جہاں خطیب اور حافظ فراہم کئے ہیں' وہیں بدترین قسم کی فرقہ بندی اور فرقہ پرستی بھی اسی طبقے سے ابھری ہے اور دین کے غلط تصورات کو بنیاد بنا کر تخریب کاری اور دہشت گردی کی ترویج کا باعث بھی یہی طبقہ بنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام طبقات ایسے نہیں ہیں لیکن جو ہیں' ان کا بھی تعلق تو اسی طبقے سے ہے نا۔

میں تو محسوس کرتا ہوں کہ:

ے ہم الزام ان کو دیتے ہیں قصور اپنا نکل آیا!!

56 کے قریب مسلمان ملکوں میں کہیں بھی طبقہ علماء نے دین کو بطور نظام زندگی برپا کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ دور جدید میں اسلامی فلاحی ریاست کے قیام' کہ جس کے ذریعے ہم اسلام کے زریں اصولوں اخوت ومساوات اور عدل وقسط کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے' میں ہم ناکام رہے ہیں۔ (ایران میں اسلامی نظام کے نام پر جو کچھ ہوا' اس میں معاشرتی سطح پر تو تبدیلی آئی لیکن معاشی سطح پر سود اور جاگیرداری نظام جاری ہے اور سیاسی سطح پر قرآن وسنت کی بجائے ''رہبر'' کی بالادستی کا طوق بھی موجود ہے۔ گویا فلاحی ریاست کا تصور وہاں بھی عنقا ہے۔) بلکہ افسوس تو یہ ہے کہ اس کی اہمیت کا احساس بھی ہمارے طبقہ علماء کے بیشتر حصے میں موجود نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اگر ہم اپنے معاملات میں خودمختار ہوتے تو یہ جدید ٹیکنالوجی بھی ہمارے ہاتھ میں ہوتی اور اسے ہم اپنی مرضی سے استعمال کرتے۔ کجا یہ کہ ہم خود اغیار کے زیر تسلط ہیں۔ کرنے کا اصل کام تو دینی حلقوں نے بھی نہیں کیا۔

بری الذمہ کوئی بھی نہیں! ہم سب ''قصوروار'' ہیں۔

والسلام' ڈاکٹر عبدالخالق

ناظم نشرواشاعت تنظیم اسلامی

9 جنوری 2003ء

☆☆☆

جناب آفتاب عروج کا مکتوب گرامی

15 مارچ 2003ء

مکرم ومحترم جناب ابوعمار مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ قاسمی صاحب سے رابطہ کے بعد آپ کا ڈاک کا پتہ دستیاب ہوا۔ انہی کی حوصلہ افزائی سے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ عرض حال یہ کہ یہ دور دلیل و برہان' حقائق وواقعات کا دور ہے۔ جذباتیت' اشتعال انگیز تقاریر و بیانات سے حقائق تبدیل نہیں ہوا کرتے۔ دوسروں کو الزام دینے کی بجائے ہمیں اپنی اصلاح کے لئے اپنی غلطیوں' فروگزاشتوں کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہئے۔ اس کے بعد گزشتہ غلطیوں سے اجتناب کے عہد صمیم کے بعد نہایت خلوص دل کے ساتھ صراط مستقیم پر سفر زندگی کا آغاز کر کے ہی ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلم امہ' اگر کہیں ہے' تو اس کا جاہ وجلال' اقتدار وتمکنت کیوں چھن گیا؟ اس تالے کی کلید کہاں کھو گئی؟ اس کا کھوج لگانے کی اشد ضرورت ہے۔ اسباب زوالِ امہ تو بے شمار ہیں لیکن سردست ہمیں فوری طور پر درج ذیل اقدامات سے آغاز کرنا ہوگا۔ (۱) ہمیں مسٹر اور ملا کی تخصیص ختم کر دینی چاہئے' (۲) دینی اور دنیاوی تعلیم کے خانے ختم کرنا ہوں گے' (۳) فرقہ واریت کی غیر اسلامی آہنی دیواریں مسمار کرنا ہوں گی' (۴) ہمیں مکالمہ و برداشت کے بند دروازے کھولنا ہوں گے۔ جیسا کہ آپ نے ایک نکتہ اٹھایا ہے' اس طرح آپ جیسے دوسرے ہمدرد دین ملت اصحاب کو بھی موقع دیا جانا چاہئے تاکہ وہ بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ اس طرح ہم اپنے مستقبل کی راہ کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس مسئلہ کو مملکتی سطح پر زیر بحث لانے کے لئے آپ کی سربراہی میں ایک ادارہ جس کا نام بھی میں تجویز کئے دیتا ہوں'

''ادارہ مکالمہ و برداشت بین المسلمین'' تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

دوران تحریر اگر کسی مقام پر سوء ادبی کا مرتکب ہوا ہوں تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کی دعاؤں کا طلب گار

آفتاب عروج

☆☆☆

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا؟

(آفتاب عروج)

مورخہ 27 دسمبر 2002ء آپ کا کالم ''ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا'' اس کالم میں آپ (عطاء الحق قاسمی صاحب) مولانا زاہدالراشدی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ صحیح مولوی کا وژن بہت وسیع اور اس کا طرز استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پہلے آپ اپنی اس دلیل کے حق میں کسی ایک مولوی کی وسیع النظری اور اس کے طرز استدلال کی کوئی ایک مثال بیان کرتے۔ اس کے بعد آپ زاہدالراشدی کی ہم نوائی کرتے تو بات جچتی اور سمجھ میں آتی۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ کیا مصلحت تھی؟ کیوں نہیں کیا؟

میں نے آپ کے اور مولانا زاہدالراشدی کے نقطہ نظر کو تاریخی اور قرآنی حوالہ سے رد کیا ہے۔ اس پر آپ اور مولانا زاہدالراشدی صاحب کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہئے۔ میں آپ کو اور مولانا زاہدالراشدی اور ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ آپ سنجیدگی سے اس بات کا جائزہ لیں کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟ میرے ان دلائل کی تردید آپ کے اور مولانا زاہدالراشدی کے ذمہ ہے۔ میں منتظر رہوں گا۔

گزشتہ صدی میں ایک شخصیت ہوگزری ہے جنہیں ہم علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔ انہوں نے بھی مولوی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

تاریخ کی چند کتب اس ناچیز کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ مسلم امہ کی معلوم تاریخ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں مولوی کو اسلامی انقلاب برپا کرتے نہیں دیکھا۔ آپ کی یہ دلیل درست نہیں کہ صحیح مولوی کا استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب! مولوی کا علم قولی و نقلی ہوتا ہے۔ دلیل و برہان، تحقیق و جستجو، جدت و اختراع، روشن خیالی اس کے نصاب میں شامل نہیں۔

زاہدالراشدی صاحب کا 1857ء سے دو طبقات کا مفروضہ تاریخ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ مسلم امہ میں جتنے بھی سائنس داں ہوگزرے ہیں، ان میں کوئی بھی مولوی نہ تھا اور نہ ہی ان میں کوئی انگریزی جانتا تھا۔ لیکن انہوں نے تاحیات تحقیق و جستجو کے قرآنی حکم کو اپنا فریضہ زندگی سمجھ کر جاری رکھا۔ مصر فتح ہوا تو ہمارے سائنسداں منجنیق اور نیپام میزائل تیار کر چکے تھے۔ تمام عیسائی حکومتیں متحد ہو کر بھی مسلمانوں کی یلغار کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ یہ تمام محققین و سائنسداں آخری عباسی خلیفہ معتصم کے دور تک کے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد مسلم امہ کا سائنسی اور تحقیقی آفتابِ علم

غروب ہونا شروع ہوگیا اور چودھویں صدی عیسوی تک بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کی سات آٹھ صدیاں مولانا زاہدالراشدی صاحب کہاں رہے اور کیا کرتے رہے جبکہ برصغیر میں سیاسی طاقت بھی آپ کے ہاتھ میں تھی؟ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاحبان علم و دانش کو کائنات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولانا زاہدالراشدی صاحب دوسروں کو الزام دینے کی بجائے اس دعوت قرآنی سے استفادہ کر لیتے تو انہیں اپنی ذمہ داری سے فرار کا راستہ اختیار نہ کرنا پڑتا۔ قاسمی صاحب کی ہم نوائی بڑی معنی خیز ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں بیسیوں آیات موجود ہیں لیکن کوئی پڑھے اور تدبر کرے تو۔ ایک دو آیات درج ذیل ہیں:

''اور اس کے نشانات اور تصرفات میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لئے ان باتوں میں بہت نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے اور کہتے ہیں کہ پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ تو قیامت کے دن ہمیں دوزخ سے بچائیو۔''(3:191-192)۔

اس آیت کے الفاظ ''دوزخ سے بچائیو'' کی یہی صورت تھی کہ مولانا زاہدالراشدی مندرجہ قرآنی ہدایات پر عمل کرتے اور عقل و دانش کو کام میں لا کر تسخیر کائنات کے علوم میں مہارت حاصل کر کے زندہ قوموں میں شمار ہوتے تو آج انہیں اس فریب میں مبتلا نہ ہونا پڑتا کہ ہم ملک میں قرآن وسنت کی راہنمائی دے رہے ہیں۔

کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے' اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس سے استفادہ کرنا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ زندگی کی دوڑ میں جو انسان' گروہ یا قوم اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو قانون خداوندی اور قانون فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے ہیں' وہی لوگ اللہ کی نعمتوں' سرفرازیوں' شادابیوں کے حق دار ٹھہرائے جاتے ہیں اور دنیا کی امامت انہیں کے حصے میں آتی ہے۔ بخشیش کی جنت خدا کسی کو بھی نہیں دیتا۔

''خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا۔'' (14:141)

''دیکھو بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔ اگر تم مومن صادق ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''(3:139)

اللہ تعالیٰ نے کافروں پر غلبہ کے لئے مومن صادق کی شرط عائد کر دی ہے اور اس میں دیگر احکامات کے ساتھ 30:32 اور 3:191-192 کی شرط بھی شامل ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے' لگ بھگ تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم امہ کا سائنسی اور تحقیقی زوال شروع ہو چکا تھا اور اس سائنسی تحقیقی علم کی شمع مغرب کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ بغداد جو اس وقت مسلم امہ کا دارالخلافہ تھا' مناظروں' مناقشوں اور نظری بحثوں کا اکھاڑا بن چکا تھا۔ عسکری قوت ختم ہو چکی تھی۔ پھر چنگیز خان آئے' ہلاکو خان آئے' بڑے لمبی دردناک داستان ہے اور پھر آخر میں وہ آئے جو ہم سے ہماری میراث لے گئے۔ پھر انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو چنگیز خان اور ہلاکو خان نے کیا تھا۔ یہ ان کا حق

تھا جوانہوں نے حاصل کرلیا۔اب امریکہ اپنا حق وصول کررہا ہے تو اب مولانا زاہدالراشدی صاحب فریاد کناں ہیں اور انصاف کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں؟؟

اب ہم آتے ہیں 1857ء کی طرف کیونکہ مولانا زاہدالراشدی صاحب نے اپنا سوال 1857ء سے ہی اٹھایا ہے۔ جب 1857ء میں روایتی سیاسی و مذہبی قیادت ناکام ہوگئی تو مسلمانوں میں شدید اضطراب' خوف' بے دلی وسراسیمگی پیدا ہوچکی تھی۔ان حالات مین مسلم قوم کے دردمند غیر روایتی اہل علم ودانش مل بیٹھے اور پیش پا حالات پر غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں عسکری قوت سے آزادی کا حصول ممکن نہیں' لہٰذا ہمیں اپنی حکمت عملی میں واضح اور نمایاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ حصول آزادی کی موجودہ کوشش کچھ عرصہ کے لئے موخر کرنا پڑے گی اور جس ہتھیار سے انگریزوں نے ہمیں غلام بنایا ہے' اسی ہتھیار سے ہمیں بھی لیس ہونا پڑے گا۔یعنی انگریزی زبان ودانش اور سائنسی علوم پر دسترس وآگہی۔مزید یہ کہ اسلام کی تعبیر کو بھی بدلتے زمانے کے ساتھ متحد وہم آہنگ کرنا ہوگا۔ان احباب علم ودانش نے علی گڑھ کے مقام سے اس علمی تحریک کا آغاز کردیا اور متذکرہ مقاصد کے حصول کی خاطر مختلف مقامات پر سکول وکالج اور سائنٹفک سوسائٹیز کا قیام عمل میں لایا گیا۔گویا یہ شعور وآگہی میں انقلاب برپا کرنے کی ابتداء تھی۔اس تمام سوچ اور فکر وحکمت عملی کی منصوبہ سازی کے روح رواں سرسید احمد خاںؒ تھے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں روایتی سیاسی و مذہبی قیادت اور سرسید احمد خاںؒ کی فکر وحکمت عملی میں تضاد کی خلیج پیدا ہوگئی جسے مولانا زاہدالراشدی صاحب انتہائی سادگی سے دوطبقات پر محمول کر بیٹھے جو واقعتاً غلط ہے۔شکست خوردہ روایتی سیاسی و مذہبی قیادت نے کبھی بھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا اور وہ حصول آزادی کے اپنے فرسودہ طریق کار پر نہ صرف بضد رہے بلکہ اسے مبنی برحق سمجھتے رہے۔اس کا ثبوت تحریک خلافت اور ریشمی رومال ایسی تحریکیں ہیں جو 1915ء تک چلتی رہیں۔

تحریک علی گڑھ اور روایتی سیاسی و مذہبی قیادت میں جو فکری وعملی تضاد تھا' اب شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا جس کے نتیجہ میں سرسید احمد خاںؒ کو کافر' ملحد' زندیق' بے دین' نیچری کے فتوؤں کی شکل میں گالیاں دی گئیں۔ان کی تضحیک کی گئی۔دیوبند کی بنیاد اسی نفرت اور تضاد فکر کا نتیجہ تھی۔وہ نفرت مولانا زاہدالراشدی کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی پاکستان میں دیوبند کے سرخیل مولانا مفتی محمود اور ان کے خلف الرشید مولانا فضل الرحمٰن اب بھی پاکستان کو گالی دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔لیکن ان کی دین سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے تمام علماء اور مفتی صاحبان مل کر بھی نہیں بتا سکتے کہ ''مسلم'' کسے کہتے ہیں۔

پاکستان کا وجود روایتی سیاسی و مذہبی قیادت کی ناکامی اور تحریک علی گڑھ کی کامیابی کا ثمر ہے جس نے غیر روایتی اور غیر مذہبی لیکن بنیادی اسلامی نظریے کی حامل قیادت علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ جیسی عظیم لیڈر شپ قوم کو عطا کی جنہوں نے محض اپنی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی سے وہ بازی جیت لی جو روایتی مسلمان حکمران اور علماء ہار چکے تھے' اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا اور ''مولانا زاہدالراشدی'' کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کرلیا۔

آج ماشاء اللہ پاکستان پچپن برس کا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پچپن برس پچپن دن شمار ہوتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک پچپن سال میں وجود میں نہیں آئے اور نہ پچپن سال میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر سکے۔ قوموں کے عروج و زوال صدیوں پر محیط ہوتے ہیں اور بے شمار ریاضتوں اور قربانیوں کے بعد ترقی حاصل ہوتی ہے۔

یہ جدید علوم پر دسترس رکھنے والوں ہی کا کمال ہے کہ پاکستان ایک ایٹمی طاقت بن چکا ہے اور جدید میزائل ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کر چکا ہے۔ جب پاکستان بنا تو ہمارے پاس ایک بندوق تک نہ تھی، فوج نہیں تھی، ایئر فورس نہیں تھی، نیوی نہیں تھی، حتیٰ کہ پاکستان بن جانے کے بعد جو انتظامیہ ہمارے حصے میں آئی، انہیں تنخواہ دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اب ہم روایتی اسلحہ میں نہ صرف خود کفالت حاصل کر چکے ہیں بلکہ برآمد بھی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اسٹیل ملز ہیں۔ ہماری بہادر افواج ہیں۔ ایئر فورس ہے جو اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ نیوی ہے۔ ہماری سول ایئر لائن ہے۔ ہماری صنعت ہے۔ انڈسٹری ہے۔ ہمارے کالج ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، میڈیکل کالج ہیں جہاں ہم اپنے طالب علموں کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں سے تحصیل علم کے بعد ملک میں اور بیرون ملک ہمارے نوجوان ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسداں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ جدید علوم سے آراستہ ماہرین نے جو ذمہ داریاں قبول کی تھیں، وہ بحسن و خوبی پوری کر رہے ہیں لیکن صدیوں کا خلا پچپن دن میں پورا ہونا قانون خداوندی کے خلاف ہے۔ پاکستان پائندہ باد۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

☆☆☆

خطوط و مضامین میں اٹھائے گئے اہم نکات پر ایک نظر

(ابوعمار زاہد الراشدی)

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب، محترم انصر رضا صاحب، محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور محترم آفتاب عروج صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور ایک اہم ملی اور قومی مسئلہ پر اپنے خیالات و ارشادات کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی۔ ان میں سے بہت سے اہم امور پر گزشتہ گزارشات میں ضروری بات ہو چکی ہے البتہ کچھ نکات پر اظہار خیال کی گنجائش موجود ہے جن کے بارے میں چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

محترم عطاء الحق قاسمی سے صرف یہ شکایت ہے کہ انہوں نے غریبی دعویٰ میں دونوں طبقات کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے حالانکہ ایک طرف عصری نظام تعلیم کی پشت پر پوری ریاستی مشینری اور وسائل چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس کا سارا نظام زکوٰۃ و صدقات، چرم ہائے قربانی اور عوامی چندہ پر چلتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دونوں غریبی دعوے میں محترم قاسمی کی نظر میں برابر ہیں تو۔۔۔

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے فرمایا ہے کہ دینی مدارس نے عام دینی تعلیم تو دی ہے مگر ماہرین پیدا نہیں کئے۔ میرا خیال ہے کہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا

اشرف علی تھانویؒ مولانا حمید الدین فراہیؒ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مولانا غلام محمد گھوٹویؒ پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ بلکہ غیر روایتی حلقوں کے حوالہ سے مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ اوران جیسے بیسیوں شہرۂ آفاق علماء انہی دینی مدارس کی پیداوار ہیں جن کی علمی مہارت اور خدمات کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر محترم کی معلومات اس سے مختلف ہوں تو ہم ان کے اظہار کا خیر مقدم کریں گے۔

آفتاب عروج صاحب نے میری اس گزارش کو رد کیا ہے کہ 1857ء کے بعد قوم تعلیمی اور فکری حوالہ سے دو طبقات میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں: ''زاہد الراشدی صاحب کا 1857ء سے دو طبقات کا مفروضہ تاریخ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔'' مگر اسی مضمون میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ: ''روایتی سیاسی و مذہبی قیادت اور سرسید احمد خان کی فکر و حکمت عملی میں تضاد کی خلیج پیدا ہوگئی۔'' اور پھر وہ اپنے مکتوب گرامی میں یہ مشورہ بھی دے رہے ہیں کہ ''ہمیں مسٹر اور ملا کی تخصیص ختم کر دینی چاہئے۔'' میرا خیال ہے کہ اس کے بعد مجھے اپنا موقف دہرانے اور اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

آفتاب عروج صاحب نے فرمایا ہے کہ عباسی خلیفہ معتصم باللہ تک مسلمانوں میں سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ میں پیش رفت کا دور تھا' اس کے بعد زوال کا آغاز ہو گیا۔ انہیں شکایت ہے کہ مولوی اس سے قبل بھی سائنس دانوں کی صف میں نظر نہیں آتا اور اس کے بعد بھی سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ درست ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سائنسی ترقی اور اسکے لئے تحقیق و ریسرچ مولوی کے فرائض میں کب شامل تھی اور اس نے کب اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا؟ یہ قطعی طور پر غیر منطقی بات ہے۔ ہر قوم میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ہر طبقہ اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے اور پوری ملی جدوجہد میں مجموعی طور پر شریک سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو زوال کا شکار ہیں اس لئے ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جن اقوام نے سائنس میں ترقی کی ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں بالادستی کے باعث وہ ہماری قسمت کی مالک بھی بن بیٹھی ہیں' ان میں بھی سائنس کے شعبے میں صرف سائنس دانوں نے ہی کام کیا ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ برطانیہ میں جتنے سائنسدان گزرے ہیں یا موجود ہیں' ان میں ایک بھی جسٹس نہیں ہے اس لئے برطانیہ کے ججوں کا سائنسی ترقی میں کوئی کردار نہیں ہے تو آفتاب عروج صاحب ہی فرمائیں کہ وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

اصل قصہ صرف یہ ہے کہ ہمارے مہربانوں نے تاریخ میں یہ پڑھ رکھا ہے کہ یورپ میں جب سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ کا دور شروع ہوا تو عیسائیوں کی مذہبی قیادت نے اس کی مخالفت کی۔ سائنسدانوں کو گمراہ قرار دیا گیا' ان پر فتوے لگائے گئے اور ان میں سے بہت سوں کو گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ ہمارے مہربان دوستوں نے معروضی حقائق کا جائزہ لئے بغیر مسلمانوں کے مولوی کو بھی عیسائیوں کے پادری پر قیاس کر لیا ہے اور لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں حالانکہ مولوی غریب نے کبھی سائنس اور اس میں تحقیق و ریسرچ کی مخالفت نہیں کی اور اس کے ثبوت میں دور جانے کی بجائے صرف ایک بات پر غور کر لیا جائے تو بات واضح ہو

جائے گی کہ ماضی قریب میں پاکستان کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کو ضروری قرار دینے اور عالم اسلام کو ایٹمی قوت کے حصول پر ابھارنے میں مختلف حلقوں کی طرف سے اٹھنے والی آوازوں میں سے سب سے بلند آواز مولوی کی تھی اور اس قوت کے تحفظ و بقا کے لئے بھی سب سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ مولوی ہی آواز اٹھا رہا ہے۔

آفتاب عروج صاحب نے مولوی کے ذمہ اس الزام کو دہرانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ اس کی مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا' اس لئے مولوی نے شکست کھائی ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے علمی میدان سے آؤٹ ہو جانا چاہئے مگر یہ الزام بار بار دہرانے والے دیگر حضرات کی طرح انہوں نے بھی یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ پاکستان کے قیام وحصول میں علامہ اقبال اور قائداعظم کی جدوجہد کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی' اس میں بھی مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالحامد پیر آف مانکی شریف اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی جیسے بڑے بڑے مولوی ان کے ساتھ شریک تھے اور اس تاریخی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر یہ مولوی تحریک پاکستان کا ہراول دستہ نہ بنتے تو تحریک پاکستان کے عملی نتائج قطعی مختلف ہوتے۔

آفتاب عروج صاحب نے مجھ غریب پر بھی کرم فرمائی کی ہے کہ مولانا زاہد الراشدی کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میری تاریخ ولادت 28 اکتوبر 1948ء ہے اور جب قیام پاکستان کی حمایت ومخالفت کی برصغیر کے طول وعرض میں معرکہ آرائی ہو رہی تھی تو دنیائے وجود میں اس وقت میرا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

ان گزارشات کے بعد ایک اصولی بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کا حوالہ محترم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور محترم آفتاب عروج صاحب دونوں نے دیا ہے کہ غلطیاں ہر طرف سے ہوئی ہیں اور کوئی بھی ان سے مبرا نہیں ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے۔ ہمیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف میں کبھی حجاب نہیں رہا۔ الشریعہ اور اس کے علاوہ روزنامہ پاکستان' روزنامہ اوصاف اور روزنامہ اسلام میں شائع ہونے والے میرے مضامین کے قارئین گواہ ہیں کہ اپنے حلقہ اور طبقہ کی غلطیوں کی نشاندہی' اعتراف اور اصلاح احوال کی تجاویز سامنے لانے میں ہم نے حتی الوسع گریز نہیں کیا البتہ یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ ناکردہ گناہ ہمارے سر نہ تھوپے جائیں اور کسی بھی حوالہ سے ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے قبل ہم سے ہمارا موقف ضرور معلوم کر لیا جائے۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ ہمارے معترضین ہمارا موقف وکردار بھی خود طے کریں' اس پر گواہی بھی اپنی ڈال دیں اور پھر منصف کا منصب سنبھال کر فیصلہ بھی خود ہی صادر فرما دیں۔ ہم اس طرح گردن زدنی قرار پانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ باقی رہی بات مکالمہ اور گفت وشنید کی تو اسکے لئے ہم ہر وقت حاضر ہیں۔ اس کے لئے کوئی الگ فورم قائم کرنے کی ضرورت نہیں؟ مسائل پر اس طرح کھلے دل کے ساتھ مختلف دانشوروں کا اظہار خیال ہی اس کام کے لئے سب سے موزوں فورم ہے۔ 'الشریعہ' اس کے لئے اس سے قبل بھی ہمیشہ حاضر رہا ہے اور اب بھی یہ خدمت سرانجام دیتے ہوئے اسے خوشی محسوس ہوگی۔

(الشریعہ' مئی/ جون ۲۰۰۳ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

نغمانہ بیٹی

سوچتا ہوں میں تمہارے متعلق کیا لکھوں' بات کہاں سے شروع کروں' میرے تصور میں تو آج بھی تم ایک پیاری سی پیار کرنے والی بیٹی ہو' پیدائش سے لے کر آخری دن تک کی یادیں میرے اندر زندہ ہیں' میرے سامنے تم نے بات کرنا سیکھا' پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا' ہنسنا سیکھا' ہنسنے کے ساتھ ہی لوگ رونے کا ذکر بھی کر دیتے ہیں' بچے روتے ضرور ہیں' تم بھی روئی ہو گی' مجھے یاد نہیں' میں نے کبھی نہیں چاہا میری بچی روئے۔

مجھے یاد ہے تم ابھی کنیئر ڈ سکول میں پڑھتی تھیں' سکول میں چھٹی ہو چکی ہوتی' میں کلینک سے بروقت نہیں نکل سکتا تھا' میں سکول پہنچتا' تم اکیلی (سارا سکول خالی ہو چکا ہوتا) بنچ پہ بیٹھی ہوتیں' سکول کا چپراسی بابا غلام مسیح ارد گرد ہی ہوتا' اس وقت بھی تم مجھے سکون سے بیٹھی ملتیں' میں نے تمہیں بنچ پر بیٹھے ہوئے روتے نہیں دیکھا۔

سکول سے کالج۔۔ کنیئر ڈ کالج کے دو سال جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے' کنیئر ڈ سے تم نے اس کی ساری اچھی چیزیں۔۔ ذہن کی کشاد' فکر و نظر کی آزادی' اپنی گھریلو تربیت کی روشنی میں سمیٹ لیں۔۔

وہاں سے علامہ اقبال میڈیکل کالج۔۔ یہ تمہاری اپنی لگن تھی' تمہارا اپنا فیصلہ تھا' تم نے یہ راستہ' یہ منزل خود چنی تھی' تم کوئی اور لائن چن لیتی ہمیں اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ ہر پروفیشنل امتحان پہلی Attempt میں پاس کرنا میڈیکل کالج میں بڑی بات سمجھی جاتی ہے اور تم نے ہر امتحان نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ ہاؤس جاب بھی بڑی لگن سے مکمل کیا۔ پھر جس تن دہی سے تم نے پوسٹ گریجویٹ تعلیم حاصل کی' پہلے ڈی جی او' پھر ایف سی پی ایس۔ وہ کچھ تمہارا اپنا ہی انداز تھا' ایسی لگن' دن رات ایک کر دیا اس حال میں کہ باقاعدہ سروس اور ڈیوٹیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ پہلی Attempt میں ایف سی پی ایس پاس کر لینا معمولی بات نہیں۔

وہ دن مجھے یاد ہے جب تمہیں ڈگری لینا تھی' میں پنڈال میں بیٹھا اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب کنوینشن کا مہتمم تمہارا نام پکارے گا اور میرا دل تمہارے قدموں کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم دھڑکے گا اور تم ڈگری وصول کرو گی' ایسا ہی ہوا' اس وقت میرا سر فخر سے کتنا بلند تھا' میرا دل کتنا مطمئن' کتنا خوش تھا اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔

اور پھر تمہاری فنی مہارت اور خوش اخلاقی نے بے شمار لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا' مجھے تو جو بھی ملا اسے میں نے تمہارا مداح ہی پایا' ایک عام مریض سے لے کر تمہارے Colleagues حتیٰ کہ تمہاری باس (Boss) جس نے ایک بار مجھے لکھا۔

You are a lucky man to have a daughter like Naghmana.

ایک مرتبہ تمہارے رشتے کے لئے انہیں کہا اور جب دوبارہ سہ بارہ یاد دہانی کرائی تو انہوں نے کہا' اتنا اچھا لڑکا کہاں سے لائیں۔

واقعی بیٹا تم لاثانی تھیں' تمہارے اندر اتنی خود اعتمادی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ خیالات کی ایسی پختگی کہ نہ کبھی تمہارا ذہن گڑبڑایا اور نہ تمہارے قدم لڑکھڑائے اور ایسے میں تم روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتی گئیں یہ خود اعتمادی ہی کا اثر تھا کہ گاڑی چلانے میں تمہاری رفتار ایسی ہوتی کہ تمہاری ماں کہتی' ''تم گاڑی کہاں چلاتی ہو' تم تو جہاز اڑاتی ہو''۔

آج میں سوچتا ہوں کہ تم خود ایک ایسا جہاز تھیں جو ٹیکسنگ (Taxing) کرتا کرتا اس سٹیج پہ آ چکا تھا کہ اب اسے ٹیک آف کرنا تھا' فضا کی پہنائیاں منتظر تھیں' پروفیشنل میدان میں تمہیں آگے بڑھنا تھا' ایک منفرد مقام بنانا تھا' ممکنات ہی ممکنات تمہارے سامنے تھے کہ ایک برے دن یہ خبر ملی کہ تمہارے اندر ایک بری اور مہلک بیماری نے گھر کر لیا ہے۔

تم نے یہ چیلنج بھی قبول کیا' اپریشن کا فیصلہ تم نے خود کیا' ہمیں تو اس وقت پتہ چلا جب تم اپریشن کے بعد کمرے میں پہنچ چکی تھیں۔ پھر علاج کے سارے مرحلے تم نے خندہ پیشانی سے برداشت کئے۔ بیماری ظالم تھی تو علاج بھی کچھ کم نہ تھا Drastic Malodies اور Drastic Remedies والی بات تھی لیکن نہ تمہارا عزم کبھی متذبذب ہوا نہ تمہارا حوصلہ' تم نے اپنی بیماری کو مردانہ وار Face کیا۔

یہ میں نے کیا لکھ دیا' نہیں میرے بچے' مرد بھی کہاں اتنا حوصلہ دکھاتے ہیں' اپنی پچاس سال سے زیادہ کی پریکٹس میں مَیں نے بہت سے ایسے مرد دیکھے ہیں جو معمولی سی تکلیف میں دل ہار دیتے ہیں گلہ' شکوہ کرتے ہیں' روتے ہیں' تمہاری ہمت و بہادری کے لئے تو مجھے ایک نیا محاورہ ایجاد کرنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں تم نے اپنی بیماری کا نغمانہ وار مقابلہ کیا' یہ تمہارا انفرادی مقام تھا' تمہاری بیدار اور توانا خودی اور خود اعتمادی تھی کہ تم کبھی مایوس نہیں ہوئیں' زیادہ تکلیف کے دنوں میں بھی جب میں نے پوچھا بیٹا کیسی ہو' تو تم نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ 'میں ٹھیک ہوں' اللہ کا شکر ہے'۔

بے شک میری بیٹا اللہ پہ ایمان رکھنے والے ہر دم اس کا شکر ہی ادا کرتے ہیں' صبر (مستقل مزاجی) اور شکر کا جو مظاہرہ تم نے کیا کافر کو بھی ایمان لانے پہ مائل کر سکتا ہے۔ کفر اور منافقت تو تمہارے لئے ناقابل برداشت فعل تھے۔ پاکستان سے مثالی محبت تمہارے کردار کا ایک ایسا پہلو ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر یہ بات مکمل ہوتی ہے نہ تمہاری شخصیت کا احوال۔

کیا آج مجھے کوئی ایسے پاکستانی کی نشان دہی کر سکتا ہے جو تمہاری طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور اس پہ کوئی بندش نہ ہو اسے تمام سہولیات حاصل ہوں اور اس نے ساری عمر اپنی مرضی سے نہ کوئی انڈین فلم دیکھی ہو نہ گانا سننا پسند کیا ہو اور نہ ہی انڈین کپڑا پہنا ہو۔ یہ امتیاز تمہیں اور یہ فخر مجھے حاصل ہے کہ میری بیٹی نے ایسا کیا' میں تمہاری باس سے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں۔

Yes I am not only lucky but proud to be father of daughter like Naghmana.

6 ستمبر کو شہداء کی یادگاروں پہ بہت لوگ جاتے ہیں ہم تم بھی جاتے رہے مگر خدا جانے تم نے کیسے معلوم کیا (ہمیں علم نہ تھا) کہ لاہور میں آر۔اے بازار کے نواح میں ایک گنج شہیداں ہے جس میں کچھ بنگالی سپاہیوں کی قبریں بھی ہیں' وہاں جانا بھی لازمی ٹھہرا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد بھی۔۔ کہ اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور۔

ہر بری چیز سے نفرت اور ہر اچھی چیز سے محبت۔ یہ نغمانہ تھی' یہ نغمانہ ہے۔

ہم لوگوں کو تم نے محبت دی' بے حساب محبت دی' میں یہ کیسے مان لوں کہ تم اپنی بیماری کی سنگین نوعیت سے بے خبر تھیں' تمہیں کوئی تنگی نہ تھی۔۔ لیکن صرف اپنے پیاروں کو دکھ سے بچانے کے لئے تم نے سارے دکھ اپنے اندر انڈیل لئے' جذب کر لئے اور ایک مخصوص دلفریب مسکراہٹ میں یہ کہنا معمول بنا لیا۔ ''میں ٹھیک ہوں' اللہ کا شکر ہے۔۔'' اللہ پہ ایمان کے ساتھ ساتھ اس بے پناہ محبت کا اظہار بھی تھا جو تمہیں ہم سے تھی' ہم گھر والوں کے لئے تمہاری محبت ایک اعزاز ہے۔ ہم اس اعزاز سے محروم ہو جانے پہ دل گیر ہیں۔

تم یقیناً بہتر مقام پہ ہو' جہاں نہ کوئی دکھ درد ہے' نہ بیماری' نہ معذوری' نہ غم' نہ آنسو۔

خوش رہو میری بیٹا!

TOLU-E-ISLAM QUOTED IN HIGH COURT

MR. JUSTICE M. R. KAYANI

Judge (who became chief justice West Pakistan High Court), recorded in his judgement (dated 19th September 1957), in the case—Ghulam Bhik v. Hussain Begum—as follows:--

> "There are four recognized sources of Muhammadan Law, namely (1) the Quran, (2) Hadith (according to some, an interchangeable term with Sunnat), (3) Qias (Reasoning by Analogy) and (4) Ijma' (Consensus of opinion among doctors of religion at a particular time in respect of some particular matter). So far as the Quran goes, I have no intention of interpreting its provisions, which are accepted generally as immutable, though in some details interpreted differently. The real difficulty comes to be faced with Hadith, which reports the Sunnat or practice of the Prophet. Apart from the fact that the authenticity of a Hadith in respect of a particular matter is seldom free from dispute, even the established practice of the Prophet in certain matters was departed from by some of the Khulafa-e-Rashidin, particularly Umar. Quite a respectable number of such instances have been stated in an excellent treatise in Urdu entitled "The Principle of Law-making in Islam", published by the Idara-e-Tolu-e-Islam, Karachi, from which I have derived great benefit. The correct attitude towards the interpretation of Muslim law as illustrated by Sunnat, if I may venture to give an opinion, would be to regard it as changeable in detail to suit the requirements of time and place. In fact, I am not giving an opinion, but indicating actual practice. It is not necessary for me to say here that the argument for Sunnat being based on revelation is not well founded."

==========

The book referred to above is

اسلام میں قانون سازی کا اصول

(P.L.D. 1957—LAHORE, 998)

Justice or Just Ice! VI

By

Aboo B. Rana

==========

It goes without saying, you may encounter errors, even illogicality and contradictions, in my line of thought. I always snuggle myself in the cozy opinion of the little knowledge that I claim to have, no thinker however erudite is without them. It would be inconsiderate and insensitive on anyone's part, attempting to convince us, to give up on the goodness in life, at any price. Except, on a promise that a much more enthralling, enchanting, charismatic life continues after this one.

Yet still, any compassionate heart would sink, if told this life is but an empty dream, a hoax. That all our efforts and struggles are only moving towards a dead end. And our deeds will end in vain. The average person thinks Islamic system is a very far fetched idea and is adamant on being pessimistic on this subject. Perhaps so, nevertheless I remain adamant on insisting Islamic system is very much plausible. If it is not possible, it shall only prove, either Evil is too powerful or our belief in Allah is too weak. These conclusions, in case of no compromise, may be flawless; nonetheless, they leave behind a bad taste and a feeling of discomfort for the believers in Quran. Allah has preserved for all times, the words of Yaqoob^{PBUH} in Quran, when he says to his sons, in Chapter 12, verse 87:

"Only disbelievers become hopeless in the mercy of Allah"

When I speak of compromise, by no ways I mean to compromise on an evil option. Too difficult to accept for a thinking heart, even a God in Heaven there happens to be. Speculate on these lines and the outlook on our life will change. The pieces of the Grand Jig-Saw puzzle will begin to fall in their places.

God creates human life above all other creatures, it is destined to conquer this Universe one day; at the same time, to grant us life equivalent not even to a dewdrop, compared with cosmic oceans of time, makes little sense. There has to be more to life than what we perceive, in order for it to be

meaningful. ‘Modern optimism, in my opinion, is doomed,’ says Lowes Dickinson, ‘unless we believe there is more significance in individual lives that appears on the surface……’ ‘That man is dead,’ said Goethe, ‘even in this life, who has no faith in another.’ These are thoughts, from the hearts of great thinkers of our present era that need be seriously considered. And they were not Muslims.

You do not have to remind me that I am fighting a losing battle. That in my case of good and evil, my arguments you will say, hardly carry any practical weight. Who cares, you may be thinking, about these matters anyway these days! If Truth depended on the counting of number of heads, no Messenger would have succeeded in this world. Truth does not make its appearance, on the number of votes. ‘If fifty million people,’ reminds B. Russell, ‘say a foolish thing. It still remains foolish.’ If Truth is beyond our world of perceptions – by which, I do not mean, it is opposed to this world – then the yardstick to measure Truth also exists somewhere beyond this world. In this universe, everything exists in relative terms. How then, should we measure the Absolute? We indeed only perceive its manifestations around us or may only dimly conceive about it. Its vibrations are sensed everywhere. With or without us. Inside or outside of us. If we cannot measure Truth by any worldly yardstick, we are unable to escape it also. ‘What appears,’ says Anaxagoras, ‘is a vision of the unseen.’ It is this elusive ascription of Truth, responsible for our skeptical glances. We shall indeed be deceiving ourselves, if we reach the conclusion that Mind, which possesses a long record of its own history, has no more to say or discover, or that this life will become extinct with our next world war. My arguments may sound reasonable to you. And yet, you have also read repeatedly in the Quran many a times the words: *Wa to izo mun ta’sha’au, wa to zillo mun ta’sha’au!* (Arabic) *It is Allah’s wish to whom He may render honours and it is His wish whosoever He dishonours.* These words of the Quran, indeed are very true, I will not deny. Though it is not as difficult a subject as most Muslims believe, nonetheless, this is just a human endeavour, for which I shall expect to be excused, in case my sentences do not sound convincing. Most Sufis because of these words have interpreted the meanings,

اُوتھے کی پروا اے راکب اُوتھے بے پروائیاں!

If the Almighty is oblivious to our deeds in this worldly life, the question comes to mind, why did He care to send Messengers with His warnings and messages, again and again? In fact, the interpretation of these words becomes more understandable, if we say, we have the right to our opinions and judgments. And yet, the burden of the final and ultimate wish rests on

Him. It is an undeniable fact, the sun, the moon, the stars, the angels in the heavens and every element in this universe move according to His knowledge, desire, commands and plan. Everyone knows this. Yet we do not have time to care and listen to the undercurrents, what He wants us human beings to do in this temporal life. Of Course, Allah^{SWT} is the owner of everything that is present and non-present. Being so, He has the right to the final wish. So that no good deed goes unrewarded and no evil deed escapes punishment. We often hear the words that our conscience did not allow us to do such and such a deed. Our conscience, dear hearts, is nothing else but society internalized. If Allah has given us '*ander ki awaz*,'(Urdu) or conscience that is capable of guiding us, separating for us the good from evil, then why the need for the Quran? Again the same question, if we cannot determine our deeds, then why must Allah put us into hell? Of what use are the warnings in the Quran, if my deeds are predetermined? It is because He is all powerful and no human can match with His knowledge that He gave us the guide book to follow. It is in the man made systems that our minds paralyse. That do not let us determine what we want to do. As human beings, if we cannot determine our actions, then why the words in the opening chapters of the Quran, هُدًى للمتقين *……..!*That it is for those who maintain *Taqwa* and wish to take guidance. Of what use is the guidance if my destiny is predetermined. If a person does not believe in Allah^{SWT} as the one and only creater of this universe, then it is a different story. And for those, who do believe in His Being as almighty, to say that conscience is also a source of guidance, brings confusion in the minds. Or for that matter, if Allah is going to decide at His own caprice, without any rhyme or reason, then why is He being compassionate and considerate to explain that taking interest on money is forbidden. What to eat and which things are prohibited for us! How must we behave in our relationships! How to manage matrimonial matters! That gambling and alchohol are prohibited! The interpretation of the words in the Quran, وتعز من تشاء وتذل من تشاء would sound more plausible, that since Allah possesses all knowledge, therefore His is the Ultimate wish as to who deserves respect and who will be the cause of His wrath.

The confusion arises in the word 'wish.' The wish of Allah is not the same as human wish. According to us, we desire something one day and then after a few days that desire changes to something else. Or we wish something and stubbornly remain glued to it, even on knowing that it was evil, what we wished for in the first place. If we read the whole Quran objectively, the meaning of 'Allah's wish' becomes quite clear. Allah's wish does not change with His moods. The wish of Allah will not change; as He is all perfect

so His wish was correct from the start. The wish of Allah will remain constant. It was Allah's wish that water must be made of hydrogen and oxygen. This wish of Allah shall stay constant for all times and at every place wherever there is water. No one has the power to change this wish of Allah. The taste of pure honey is made sweet by the wish of Allah. It shall be so wherever there is honey anywhere in the world. It is Allah's promise these wishes will not change. Nor does anyone else have the powers to change them. Wherever there is honey, its taste will stay permanent for all times. Allah only demands from us to have faith in them. The same holds true in binding human relations, the basic wishes or principles of Allah in the Quran will not change. Now if we Muslims cannot live in peace as a family, it only means we have not understood the wishes or principles of Allah that are in the Quran.

We are commanded in the Quran to explore these principles and have faith in Allah's promise. When we behave and act according to what He desires that is in the Quran, in that case He wishes honour. What He wishes and what He desires us human beings to do, is all explained in the Quran, for him or her whosoever wants guidance. And the basic structure of commands of Allah explained in the Quran are constant and for all times to come. The natural fruits that we eat everyday, do not distinguish between Muslims and Non-Muslims. Apple juice is healthy not only for a Muslim or only for those who maintain *Taqwa.* Fresh air is healthy for everybody. All blessings of nature are free for everyone. The actual problem that we Muslims are encountering is that we have lost the spirit of Quran.

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

The purpose of sending Quran is to make human beings good by choice and not by force. We continue to teach the meanings of Quran in bits and pieces. In doing so, sometimes the essence of Quran is lost. For example, Quran narrates in chapter 11, verse 6: *"Wa'ma min da'abba tin fil ardi illa allala hee rizqoo ha……"* (Arabic) *The responsibility of Rizq* (nourishment and provisions) *of every walking creature on earth is on Allah.* Indeed, every thinking heart observes, this is not what is happening in our practical day to day living. Apparently this verse appears to us as a contradiction. Majority of the innocent people in the under developed countries either starve or are under nourished, living in sub-human conditions. The convicts, rapists and murderers enjoy healthy meals in prison cells, while most of the educated ones, fresh out of college, who are honestly struggling in life, are either under nourished or hardly get two healthy meals. The argument that is put forth by our Muslim priests and scholars is that since

Allah knows best, so it is His wish. Very easy to take the responsibility of the shoulders and throw it on Allah. Are we conveying to the innocent mind, it is Allah's wish that convicts in prison cells must have healthy meals and the educated ones must starve or walk around like stray animals looking for food, or remain undernourished on this earth? This state of affairs will spin anyone's head and make him insane. It is in these circumstances, the average mind becomes a victim of all kinds of mental diseases and sick. Are these priests saying it is Allah's wish that thugs and murderers must get regular meals and those who have struggled for years in schools and colleges, must remain under nourished? This situation only implies that Allah wishes the tyrants and criminals to live and the innocent ones must starve. The other possibility is, those who are already established, encourage new comers into the profession to commit crimes, so they may be able to overpower them in their careers? If not nepotism, what else do the administrators expect in these conditions? As every family wants to survive with some peace of mind. This is not Islamic thinking, gentle hearts, these are careless and evil minds at work. We are only playing fast and loose with nature. **This kind of thinking only brings in more aggression instead of peace.** Quran narrates in clear words:

> ***"And Allah is not the kind who would have been cruel to them; they were brutal to themselves!"*** (Chapter 9, verse 80)

And *"His blessings that Allah grants will not change, until the people themselves change their hearts. As Allah is all hearing and all knowing"* (Chapter 8, verse 53) Are these priests implying that Allah has blessed murderers in prison cells with meals and punished those who struggled to educate themselves? Please do not give me it is Allah's wish for crying out loud. It is not even a laughable situation. It could become a healthy culture if only the officials would think of switching the situation the other way around. All Muslims have read in Quran that Allah does not favour tyrants. Yet, in the same breath, we are teaching, *"Bismillah hir rahman nir raheem," In the name of Allah the most magnificent, the most merciful*. And the priestcraft further argue:

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں!

Any civilized mind is bound to think, where is the magnificence and where is Allah's mercy? Please, thinking hearts, do spare me from this kind of logic. Obviously, this will never make sense to a growing mind or to anyone. And every one knows this is not making sense in our practical world. These are questions that sprout in the minds of students studying Quran; finding no satisfactory answers, they turn to atheism or become civilized convicts. A

thinking mind reaches the conclusion that in this selfish practical world, good deeds are only in children's stories, books, plays and movies.

These are not, gentle hearts, tales from beyond. I am writing from personal experiences. After sixteen hours of continuous painstaking work when I use to come home, with just enough energy to make it to the doorstep, my so called Muslim wife did not care to know if I had had a meal. All she was interested in was money. I received scholarship documents in my office to be completed, for advanced studies. The head clerk of the department in which I was teaching in Pakistan, delayed in bringing me the needed papers from the administration, as he wanted money under the table. Till today I am suffering, as I was unable to send the documents of scholarship back before the deadline date. I could start from the beginning and write a whole book on my personal experiences and struggles that will freak the living daylights out of any sane human. As I am not the only one, as well as that is not my intention here, so I will leave this topic, with just these two incidences. All our struggles and human efforts will go in vain, lovers of Quran, as long as cheating and deceiving are on the rampage. We all make mistakes, and expect to be forgiven. And usurping, swindling and eavesdropping are not mistakes, these are evil habits.

Spare a moment of your careful thought, and try to see with me, in the true light of Quran; the truth is these problems will never be resolved, in a world of race for power and money. The world systems nowadays are teaching us to become fearless in this race for power. And the rules of Quran are teaching us on how to become good human beings. Families have always flourished in the race for goodness. Whereas in the race for power and money families are devastated. Since there are no scruples in the lust for power and money.

Caliph Omar-e-Farooq^{R} during his reign said, "Omar shall be held accountable in the court of Allah even for a stray dog that died from hunger in his domain." It is this kind of Islam, gentle hearts, Allah^{SWT} wants us to believe and practice. Quran tells the leaders of Muslim nations to have fear of Allah in their hearts. In this statement of Omar^{R}, it is not only food for the body that Omar^{R} is speaking of, but there is also food for thought. Omar^{R} speaks not only of the hunger of Muslims. He meant food for all walking creatures in an Islamic state. When the system of Allah is established, the upholders of true Islam shall see to it that no living creature goes to sleep without proper nourishment. Be it human or non human. *It is in this context,* (when Muslims uphold the principles of Quran as a whole and not in parts) *Quran takes the responsibility of providing nourishment to every living creature on Allah.*

Individual efforts conducted can be included in good deeds or an Islamic deed; to give it the name of the real *Deen* of Islam is wishful thinking. We all know that Allah has never come down personally to provide food to anybody. And Allah will not claim responsibility of those nations in which people capitalize on others mind and body. It is only in a true Islamic state when leaders and heads of state will stand for the words in Quran, with solemn faith; it is then and only then the words of Quran will take practical shape. It is then our prayers will have power and wings to reach the skies above us. In a true Islamic state every evil idea, recidivism or nepotism is nipped in the bud. Contrariwise, in every other system, these ideas remain cold power that is just ice. In Islam there is no force or aggression. Quran is very explicit on this account. *The words "La iqra fid Deen" in Chapter 2 of Quran mean Islam has to be embraced without compulsion.* The only power in Islam is an honest leader who loves and cares for his people. We are free to choose whether we want a system in which people take responsibility for each other or do we want a system in which people's motive is for material things in their deepest intentions.

The problem, gentle hearts, we face in our relationships and dealings is because, as Muslims, we are not educated enough to think on the words of the one and only Book we claim to believe in. The general attitude of the common man has been perfectly expressed by our famous poet Faiz Sahib when he says:

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

We indulge in all kinds of bizarre lunacies and expect Allah to address our problems and take care of us. It is about time, we seriously sat with our heads together and forgave each others misgivings, misfires, miseries, handicaps, idle gossiping, complexes, our pessimistic thoughts and scuttle butting; scuzzy intrigues, fake vanities and false egos. These shall never lead to our peace to mind or ensure us a peaceful life. Again, gentle minds, do not be mistaken. Life, I never said is a bed of roses……..! It will never be so, as long as Devil is alive and among us. What I am asserting is that we have a choice. Do we want to be governed by God or by the Devil? The choice is yours and mine for the making. I shall be the last person to take this freedom of choice away from you. But whatever choice you make, be sincere and honest about it with yourself. No one else can choose for you, only you know better about yourself. The ancient saying of Socrates,' Know Thyself,' is as much true today as it was in the times of the Greek savant. If these words of a

sage can live for more than a thousand years, I find no reason why Islam was called a fired cartridge. Words of God and only a little over 1400 years old. This time span is negligible when seen in context with the making of human history. Unless we have become complacent in idolism. That Islam and its demands are a burden on life and Paganism is more than enough for our life styles. Just like the rich Arab tribes who became brainwashed with idolism, before the advent of Islam. This universe in its infinitude of materials is certainly not only the ideas that have arisen out of it. And if ideas or philosophers are dumb, then every idea or philosophy is as dumb as any other. Since all ideas have evolved from the same material mind. The prerogative, if a prerogative it is of this life is ours, then we are the ones paying the price for living on this earth.

Especially, in our age, in which the moralists have concluded, there is no good or bad. Only our thinking makes it so. This conclusion, to which I would like to agree with, would sound more convincing, could they start from the foundations and say, there is no life or death. Only our thinking makes it so. All good and bad, from my point of view, emerge from our profoundest concept of life and death. Since we did not create Life, so we will never know what is good or bad for it. From the Quran we learn that Life is a good concept; in it we burgeon, unfold and bloom. Just so if anyone does not like to agree with this opinion or his thinking prohibits him to believe in this view, does not mean that life is bad. If it still isn't clear to our abstract moralists, I humbly beg them to have their brains ventilated. If we have a strong zeal, for the enchanting and mesmerizing regions of God, we shall have to confront and accept first of all, that Evil force. When we want to act in God's ways, we ought to be familiar too with Satan's world. Our ignorance of Satanic forces is the main thrust in the cause of all wars in this world. All matters about life, in the end, exist in our denials and approvals. The 'Yes' and 'No' is the primary binary system in our lives. An example of the subtle ways as to how Evil creeps into our minds, is a line from the poetry of one of the famous Sufi poets of Indo-Pak subcontinent. While speaking of Allah he says: *"Thug aus thuggan day thug noo!"* (Punjabi) May Allah^{SWT} forgive us for such blasphemy in our sufi literature. The mind freezes and the body shivers on hearing such words.

The English word 'thug' has been derived from this same word which has its origins in Hindi and Sanskrit word '*sthagati'* or *'sthagayati'* that is spoken in northern India. The word thug means a 'hired assassin, a cutthroat.' And no authority cares to put a censor or ban on such kind of poetry being recited in *Qawalis* and in our folklore music that is corrupting the thoughts of simple minded folks. But we do like to put a label of 'wet paint' on the literature of Allama Parwez^{R} and Dr. Iqbal^{R} during their lifetime.

What use is a value in life, if it doesn't move us – like our daily prayers that we accept only as a habit, as if we are doing God a favour. After our prayers, we come out of our places of worship and go our own ways, doing what we did before and living in the false hope that our life will change. If our beliefs do not move us, we have only two causes for it. Either there is something deficient or lacking in our belief, since we did not understand it in the first place or our mind is disordered and cannot comprehend the real meanings of a belief. If an individual, society or nation ceases to believe in itself truly, if its aims and goals are not clear, others with clearer beliefs and stronger desires will take their place. If we cannot see or visualize natural paths, past records of civilizations prove, nature finds no difficulty in creating those who do. It is only a matter of time! Quran states in, chapter 9 verses 38 and39 on this issue:

If you all will not stand up for Allah; He will create others in your place.

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

But the trouble makers of today and non-believers, really know how to do *'Fee sabi'lillah fa'saad.'* These trouble makers shall meet us as Muslims and then start their fireworks. There is only revenge and hatred in their hearts. These two characteristics in any nation have always brought in undue aggression instead of cooperation. To err is human and to forgive, they say, is divine. Revenge is selfish and spreads grievances, while in forgiveness there is pleasure. Forgiveness brings peace of mind.

Gentle minds, there is a certain direction, in which nature is moving us. Just as a train that needs rails on which to put its wheels, to reach its point of destination, so it is with nature. No one can bribe God's system. It has its own laws and principles to make things move in a certain direction. Laws that govern our human instincts. In the same manner as there are laws governing all that is around us. Laws that work in the sciences and arts equally. Be it physiology, psychology or parapsychology, chemistry or physics, fine arts, medicine, history, or any other subject. Whether it is mind or matter, it makes little difference. Indeed, without laws there would be anarchy in this world and we would be lacking in beauty or pleasure. When we cease to adapt ourselves according to natural working, it shall replace us with those who are inclined towards it. As we remain of no use in nature's workshop. Before the angels become desperate and pass us away from this world, like so many other anonymous beings, it would be wiser to understand the details of life, its demands and its requirements. Thereby learning to respect each other's freedom, in this mighty ocean of humanity.

Until now, our systems of thought remain seasonal, they come and go like the weather. Or like a wall clock pendulum, they swing between capitalism and communism. Until now, we have not succeeded in arresting the swing of this pendulum, from one extreme to the other. The time-ridden and moth-eaten systems of the past, infected with hatred, prejudice, vanities and fallacies, have failed us in reaching the natural system of thought. In spite of that we do not take a lesson. We tolerate the pains and afflictions, in the hope someday in the future nature will provide the answers to the perplexities of the world that baffles us. Well, we have a choice, we can continue to tolerate the pains or change our system. The obstacle to this natural system of thought, is nowhere outside, it is within us. Mankind has turned its back to nature. We make ourselves believe that we are living according to nature. Only to realize afterwards, it was just another mirage, in which our thoughts were trapped. Humankind exists in nature, grows in nature, but unfortunately, uses it to make its own world of abstractions, from the materials scattered around it. From its inborn talent to form ideas, creates for itself a distorted world. Cutting the very branch of the tree, on which it sits. With every turning of an era, we bring forth another illusion, another hallucination, apparently to motivate us mortals towards life. Another mirage attracts us, to quench our thirst, for a meaning to this seemingly ambiguous life. These illusions and hallucinations are created by our irrational fears and fancies of the unknown. These are not new systems of thought. They have been erected in every age, by mixing the same old traditions and folklore, upon which stood the towers of previous systems and crumbled. The ruins of those lost civilizations in time, yet, stand. To remind us, time and again, only for those who want to think and believe.

The angels must be desperate, yet they are silent, at the irony that all finer aspirations of mankind end in the grave. Perhaps it is happening so, just to comfort other souls, waiting somewhere in this mysterious universe, to be born; searching for a chance to live and make their share. If for nothing else, just to arouse in humankind the thought, they need a sound and solid universal system of values that shall never break or shatter again. And shall withstand any calamity, for all times to come. The stars and the moon, the angels among our desperate gods, wait in silence, as they have no choice, but to tolerate the follies of humankind, till it discovers all the secrets of this Universe. You all Muslims seem to be comfortable in the present justice system. Frankly speaking, for myself, I find it totally absurd. For me the present justice system is only just ice. It eschews Islamology, as it seems to hurt the human pride when one reads the story of Hadith. Well, call it by whatever other name you want to but let us make sure, for God sakes, the

school of thought or ideology we make for ourselves this time, will not let us down.
June 7, 2003